تعزیت نامے

ستار طاہر

تعزیت نامے

ستار طاہر

سرورق: سلیم اختر

بار اوّل: ۱۹۰۹
تعداد: —— ۱، ہزار
قیمت: —— ۱۵ روپے
ناشر: مکتبہ اقرا، ۵۵ میکلوڈ روڈ لاہور
طابع: الجنہ پرنٹرز، لاہور

ترتیب

۱: امتیاز علی تاج ۹
۲: حجاب امتیاز علی تاج سے گفتگو ۱۲
۳: ایرک ماریا ریمارق ۱۹
۴: جان ڈاس پاسوس ۱۲
۵: سید عابد علی عابد ۱۵
۶: مولانا غلام رسول مہر ۳۲
۷: یوکیو مشیما ۳۸
۸: سراج منظامی ۴۶
۹: ریاض شاہد ۵۳
۱۰: تنویر نقوی ۶۲
۱۱: ذکی بی۔اے ۵۰
۱۲: ایس ڈی برمن ۰۱
۱۳: فیروز نظامی ۰۳
۱۴: ہما اسمٰعیل ۰۳
۱۵: سائمن مرنا ۰۸
۱۶: ہاورڈ ہیوز ۸۹
۱۷: صوفی تبسم ۹۲
۱۸: پی۔جی۔ وڈہاوس ۹۴
۱۹: وٹوریا ڈی سیکا ۸۴
۲۰: پال رابسن ۱۰۴

۲۱ : ریاض جاوید ۹۵
۲۲ : خواجہ ابتسام احمد ۱۰۳
۲۳ : سیّد وقار عظیم ۱۰۱
۲۴ : جاں نثار اختر ۱۰۴
۲۵ : قاضی نذرالسلام ۱۰۹
۲۶ : مکیش ۱۱۲
۲۷ : شورش کاشمیری ۱۱۵
۲۸ : مشیر کاظمی ۱۲۹
۲۹ : منور ظریف ۱۲۲
۳۰ : ماں جی کو پُرسہ ۱۳۳
۳۱ : مہندر ناتھ سرلا دیوی کی موت پر
کرشن چندر کو پُرسہ ۱۴۰
۳۲ : کرشن چندر ۱۴۵
۳۳ : انشاجی تم زندہ رہو ۱۵۲
۳۴ : زنجیر پڑی دروازے پر ۱۵۷
۳۵ : چارلی چپلن ۱۶۹
۳۶ : ابراہیم جلیس ۱۶۲
۳۷ : رشید جاوید ۱۷۷
۳۸ : کتبوں پر لکھی ہوئی داستانیں!! ۱۸۱

اطہر جاوید
اور
منظفر محمد علی کے نام!

حرفِ آغاز

یہ مضامین جو "تعزیت نامے" کے عنوان سے آپ تک پہنچ رہے ہیں۔ یہ پچھلے دس برسوں میں لکھے گئے تھے۔

پچھلے دس برسوں میں ملکی اور عالمی ادب اور فلم، سٹیج اور فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا بڑا کنٹری بیوشن تھا، جنہوں نے اپنے شعبوں میں بڑا کام کیا اور بڑا نام پیدا کیا تھا۔ ان لوگوں نے انسانیت کے حسن کو سنوارا، اور ہمارے لیے ایک بہتر دنیا تخلیق کرنے کی کوشش کی۔

پچھلے دس برسوں میں میں نے مرنے والوں پر بہت مضامین لکھے۔ تعزیت نامے' میں وہ سارے مضامین یکجا نہیں کیے جا سکے۔ بہت سے مضامین۔ ذاتی انتخاب کی نذر ہو گئے۔

ان مضامین کو یکجا کرنے کے بعد میں نے دوبارہ پڑھا اور خود میں نے محسوس کیا کہ ان مضامین میں تنوع ہے۔ یہ تنوع میرا پیدا کردہ نہیں بلکہ ان رنگارنگ شخصیات کی دین ہے جو اِن دس برسوں میں دُنیا کو بہت کچھ دے کر رخصت ہوئے تھے۔

ان مضامین کو کئی خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ کچھ مختصر ہیں اور سوانحی انداز لیے ہوئے ہیں۔ کچھ مضامین ایسے ہیں جو سراسر ذاتی احساسات، ردِّعمل اور یادوں پر مبنی ہیں۔ بعض مضامین تاثراتی ہیں۔

ان میں بعض مضامین میں ایسی شخصیات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے جن سے میں زندگی میں کبھی ملنے کی سعادت حاصل نہ کر سکا۔ جو زندگی میں میری رسائی سے دُور رہے۔ بعض ایسے ہیں جن کے ساتھ خط و کتابت رہی۔ کبھی بالمشافہ ملاقات تک نہ ہو سکی۔ اور بعض ایسے ہیں جن سے گہرے تعلقات قائم ہوئے۔

ایک قدر مشترک ان سب مضامین میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ مضامین ان تمام حضرات کی وفات کے فوری بعد لکھے گئے۔ ان کی وفات پر میرا جو ردِ عمل تھا۔ وہ میں نے بلا کم و کاست قلم بند کر دیا تھا۔ یہ یقینی امر ہے کہ آج میرا ردِ عمل کچھ مختلف بھی ہے۔ لیکن میں نے ان مضامین میں کوئی اضافہ یا ترمیم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ وہ جس طرح شائع ہوئے تھے۔ اسی طرح انہیں اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔

اس کتاب میں جن شخصیات کی وفات پر مضامین ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض بیحد مشہور و معروف اور عالمی شہرت کے مالک لوگ ہیں بعض مشہور کم مشہور اور کم معروف لوگ ہیں لیکن چونکہ میرا کسی نہ کسی طرح ان سے رابطہ اور تعلق رہا ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح ان سے متاثر ہوا ہوں۔ اس لیے ان کی زیادہ شہرت یا کم شہرت میرے لیے کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ ذاتی تعلقات، احساسات اور تاثرات ان شخصیات پر لکھنے کو اکساتے رہے تھے، اسی لیے ان پر لکھا گیا تھا۔

"تعزیت نامے" کے بعض مضامین — شاید اس "فریم" میں بظاہر پورے نہ آتے ہوں۔ لیکن اگر کتاب کے مجموعی مزاج کو سامنے رکھا جائے تو یہ مضامین بھی اس مزاج کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔

یہ مضامین کئی اخبارات اور جرائد میں پچھلے دس برسوں میں شائع ہوتے تھے۔ ان کی مکرر اشاعت پر میں ان تمام اخبارات اور جرائد کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے بعض قارئین کی طرف سے یہ اعتراض کیا جائے کہ اگر ان مضامین کے ساتھ ساتھ شخصیات کی تاریخ وفات لکھ دی جاتی تو بہتر ہوتا۔

افسوس کہ میں — اس "بہتر" کام کو جان بوجھ کر نہیں کر رہا۔ کیونکہ میرے خیال میں اس طرح یہ "تدریسی" انداز ہو جاتا ہے۔ اور میں سن و تاریخ کے چکر میں پڑ کر نہ تو خود اپنے احساسات کو مجروح کر لینے کا قائل ہوں اور نہ ہی یہ تاثر اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔

ایک ترتیب سے مضامین شائع کیے جا رہے ہیں۔ اس ترتیب سے ہی
اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلے کس کا انتقال ہُوا اور کس کا تعزیت نامہ پہلے لکھا گیا۔
یادوں، اور تاثرات کو ماہ و سال کے حوالے سے دہرانا میرے نزدیک
ان زندہ شخصیات کے ساتھ زیادتی تھی جو اگرچہ دنیا سے اُٹھ چکے ہیں لیکن
اپنے کام اپنی یادوں اور محبتوں کے حوالے سے میرے دل میں سب کے دلوں
میں زندہ ہیں، ہمیشہ زندہ رہیں گے۔
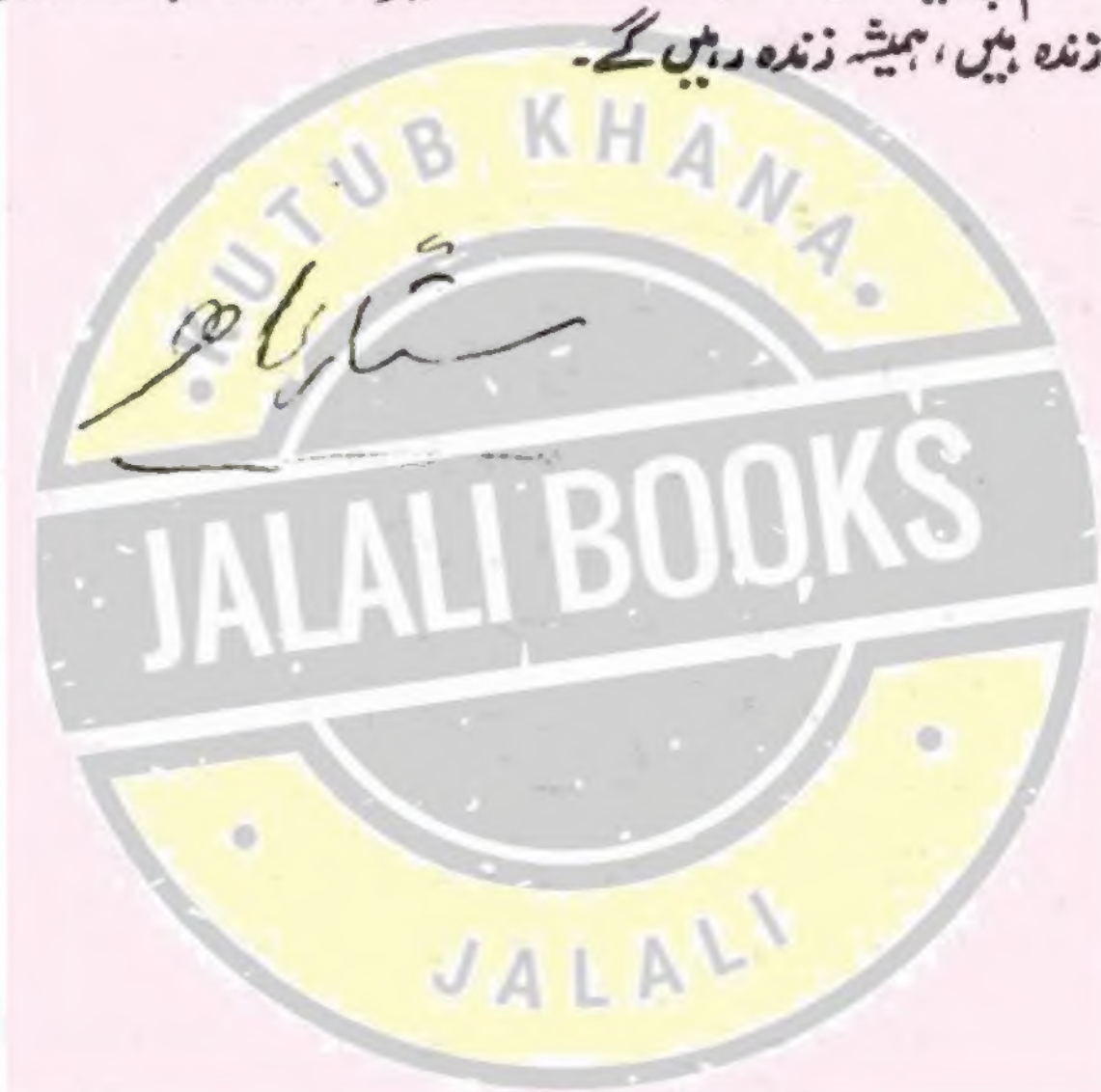
امتیاز علی تاج

چند دن پہلے پاکستانی مصنفین کی ڈائرکٹری کے سلسلے میں تاج صاحب نے اپنا فارم پُر کرکے بھیجا تھا۔ قلمی نام کے خانے میں انہوں نے "ساعت" لکھا تھا۔ بس سے سید، ا سے امتیاز، ع سے علی اور ت سے تاج ـــ آج وہ ایک ایسی "ساعت" بن چکے ہیں جو کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی اور ان کی زندگی پر "ساعت" وارد بھی ہو چکی ہے کہ اہلِ لغت ـــ "ساعت" کو موت کا متعین وقت بھی کہتے ہیں ـــ

ان کا جسدِ خاکی قبر میں اتارا جا رہا ہے ـــ ان کے احباب، دوست، ساتھی اور مداح غمگین، آزردہ اور اداس کھڑے ہیں ـــ زرد رُو، نحیف و نزار سید عابد علی عابد کہہ رہے ہیں:

"وہ تو ایسا آدمی تھا جو مخاصمت پال ہی نہیں سکتا تھا ـــ پھر نہ جانے اسے کیوں قتل کر دیا گیا ـــ وہ تو کبھی اونچے لہجے میں بولتا بھی نہ تھا۔ وہ کسی سے لڑائی کیسے مول لے سکتا تھا۔"

یہ سب سچ ہے۔ تاج صاحب سے ملنے والے ان کے اخلاق، متحمل مزاج، شائستہ آداب اور وضعداری کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ مگر اسے کیا کہیے کہ ایک انتہائی شائستہ مزاج، نفیس الطبع اور وضعدار انسان کو قتل کیا جا چکا ہے ـــ

تاج صاحب کا قتل — ان کی شریفانہ، مہذب، بااخلاق، وضعدارانہ اور شائستہ زندگی کا اینٹی کلائمکس ہے —

تاج صاحب نے ایک بھرپور زندگی گزاری — وہ نیازمندانِ لاہور میں سے تھے۔ شمس العلماء مولوی ممتاز علی اور محمدی بیگم کا یہ فرزندِ دلبند ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو پیدا ہونے والا بچہ — ۲۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو دنیا سے اٹھ گیا — تاج صاحب کی فتوحات کی فہرست بڑی طویل ہے۔ پھول اور تہذیب النسواں کی ادارت گورنمنٹ کالج کی سٹیج پر اداکاری، شکسپیئر کے کھیل "اے مڈسمر نائیٹس ڈریم" کا ترجمہ ۱۹۱۸ء میں کہکشاں جیسے جریدے کا اجراء — اور پھر انہوں نے اپنے آپ کو ڈرامے سے متعلقہ شعبوں کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں 'انارکلی' شائع ہوا اور اسے اردو کا عظیم ترین ڈرامہ قرار دیا گیا۔ ہمارے ادب میں بہت کم ایسی تصانیف لکھی گئی ہیں جو ایک مختصر عرصے میں اپنے مصنف کی زندگی میں ہی کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیتی ہوں۔

تاج صاحب ایک مخصوص تہذیبی عہد کی پیداوار تھے اور انہوں نے اپنے لیے خاص تہذیبی ماحول کو بھی جنم دیا۔ پطرس، تاثیر، حفیظ جالندھری، فیض، چغتائی — یہ اپنے دَور کے وضعدار بزرگ تھے، جنہوں نے تہذیبی اقدار کو نیا حسن بخشا ہے۔

ادب، فلم، ریڈیو، سٹیج، ڈراما — تاج صاحب نے ان تمام شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ انہوں نے "چچا چھکن" جیسا کردار اردو ادب کو دیا — "قرطبہ کا قاضی" جیسا کھیل لکھا — ریڈیو پاکستان سے قیام پاکستان کے فوری بعد "پاکستان ہمارا ہے" جیسا کامیاب پروگرام پیش کرتے رہے، جو پورے ایک سو دن تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا — انہوں نے خاندان، زمیندار، دھمکی، پگڈنڈی جیسی فلمیں لکھیں — گلنار کو لکھا اور ڈائریکٹ کیا — انتظار اور زہرِ عشق کے مکالمے لکھے — سٹیج پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے — ریڈیو پر اپنی آواز کا جادو جگایا اور اب وہ

مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور کے ناظم کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔۔ اردو ڈرامے کی تاریخ اور اردو ڈراموں کے ذخیرے کو مدوّن کر کے شائع کرا رہے تھے کہ ان کو قتل کر دیا گیا۔

آج حجاب کا ساتھی بچھڑ گیا اور "انارکلی" کے معنی خیز اور خوب صورت انتساب کا ایک ایک لفظ اداس ہے اور تاج صاحب مٹی کے نیچے سو رہے ہیں۔

یٰسمین کا شفیق باپ آج دنیا میں موجود نہیں ۔۔ ایک بھرپور زندگی گزارنے والے انسان کا یہ انجام کتنا کربناک ہے ۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص ایسے بے ضرر انسان کو کیسے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے ۔۔ مگر یہ انہونی بھی ہو کر رہی۔

وہ امتیاز علی تاج ۔۔ جو ۴ ایبٹ روڈ پر رہتے تھے، بلاشبہ وہ مر چکے ہیں ۔۔ کسی شقی القلب نے ان کو قتل کر دیا ہے۔ مگر وہ امتیاز علی تاج جو "انارکلی" کے خالق ہیں، جو اردو ڈرامے اور اس کی تاریخ کو مدوّن کر چکے تھے جو "چچا چھکن" کے حوالے سے ہمیشہ ہنساتے رہیں گے، جنہوں نے اسٹیج پر اداکاری کی نئی مثال قائم کی، ریڈیو ڈراموں کو نئی رفعتیں بخشیں، جو نیاز مندانِ لاہور میں سے ایک تھے، جنہوں نے بعض خوب صورت فلمیں لکھیں ۔۔ وہ امتیاز علی تاج کبھی نہیں مر سکتے، کبھی قتل نہیں کیے جا سکتے ۔۔ آدمی فانی ہوتا ہے، مگر اس کا کام لافانی ۔۔ اور لازوال ۔۔

حجاب امتیاز علی تاج سے گفتگو

فاصلے — اجنبیت — منزلیں — اپنائیت —
روٹھنا، منانا —
آپ نہیں جانتے —
کوئی بھی نہیں جانتا —
اور جو جانتے تھے ان میں ایک لحد کی گود میں سو رہا ہے اور دوسرا زخمی حالت میں بستر پر پڑا ہے — اجنبیت کے فاصلے کٹ جاتے ہیں — روٹھنے والے من جاتے ہیں — اپنائیت کی منزلیں آجاتی ہیں — عمر کا فاصلہ آگے بڑھتا رہتا ہے — رفاقت کا بندھن خوب صورت اور مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر ایک رات آتی ہے۔ ایک رات — یہ ایک رات دنیا بدل کر رکھ دیتی ہے۔ اب کوئی کیسے روٹھے۔ کیسے منائے — قاتل کا ہاتھ رات کی تاریکی میں پھیلتا چلا جاتا ہے — اس ہاتھ میں خنجر ہے جو تمام انسانی رشتوں کو قتل کر دیتا ہے — ایک جو جاننے والا تھا وہ خون میں لت پت ہو کر ڈھیر ہو جاتا ہے اور دوسرا جاننے والا زخمی ہو کر سالوں کی چپ کا قفل توڑ دیتا ہے —
انارکلی کا خالق دنیا سے اُٹھ گیا —

مگر حجاب کا امتیاز ان کی یادوں میں زندہ ہے۔ کبھی نہیں مرے گا — اور وہ بستر پر بیٹھی اپنی کم گوئی کی عادت اور روایت کو ترک کر کے بولتی چلی جا رہی تھیں — یادیں — یادیں — جو مرتے ہوئے آدمی کو بھی مرنے نہیں دیتی —

"آپ جانتے ہیں کہ امتیاز سید تھے۔"

مگر آپ نہیں جانتے — کہ وہ شہید ہیں اور پیاسے بھی تھے۔

دیکھیے، یہ مت لکھیے گا کہ ان کو قتل کیا گیا — امتیاز شہید ہیں — وہ قتل نہیں ہوئے — امتیاز سید تھے، شہید ہیں اور پیاسے تھے —

آپریشن کے بعد انہوں نے پانی مانگا تھا — مگر ڈاکٹروں نے بوجوہ انہیں پانی نہ دیا۔ ہونٹوں کو معمولی سا تر کر دیا تھا — وہ دنیا سے پیاسے اٹھے — شہدائے کربلا کی رسم پوری کی —

"یاسمین مجھے کہتی ہیں، ممی سب کو تو تفصیلات کا علم ہے، پھر آپ کیوں بار بار بتاتی ہیں — یاسمین نہیں جانتی کہ تفصیلات کے حسن کو تو میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔ جی ہاں ان DETAILS کی خوب صورتی کو کچھ میں ہی بیان کر سکتی ہوں۔ بجیاں — یہ میری بجیاں ہیں — ان سے پوچھیے — اب میں باتیں کرتے ہوئے تھکان محسوس نہیں کرتی — تھکتی ہی نہیں ہوں — صبح سات بجے شروع ہوتی ہوں تو رات تک بولتی رہتی ہوں۔ سب حیران ہیں — مگر اسے کیا کہیے کہ جزئیات کا حسن بار بار دہرانے سے ہی نکھرتا ہے اور جزئیات کی خوب صورتی میں ہی بیان کر سکتی ہوں:

"وہ رات بہت حسین تھی — بہت خوب صورت — ہوا چل رہی تھی — آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے — ان بادلوں میں کتنا حسن ہوتا ہے — مجھے تو ان سے عشق ہے، مگر بہت سارے بادل جمع ہو جائیں تو مجھے اچھا نہیں لگتا — اور پھر بادل جمع ہو گئے تھے۔ بہت سارے بادل — کالے دھبے۔

پھر بھی وہ رات بہت حسین تھی — میں امتیاز کی آواز سن کر اٹھی تھی — وہ کہہ رہے تھے : "یہ کیا کر رہے ہو ؟" اور ایک نقاب پوش ان پر وار کر رہا تھا — امتیاز نے اسے میرے سامنے گرا دیا — میں نے ان سے پوچھا : "تمہیں کیا چاہیے — چابیاں ؟" مگر وہ خاموش رہے — دونوں نقاب پوشوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی — ایک نقاب پوش نے امتیاز کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور ہاتھ گھما کر پشت پر وار کیا۔ میں نے اسے روکا تو اس نے مجھ پر وار کر دیا — دل کے قریب — ڈاکٹر کہتے ہیں : میں خوش قسمت ہوں — اگر وار تھوڑا سا اور اوپر ہو جاتا تو دل پر گھاؤ لگتا — میں زخمی ہو گئی۔ میں شور مچا رہی تھی — امتیاز ہوش میں تھے۔ بڑی جان تھی ان میں — نقاب پوش بھاگ گئے — امتیاز سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے۔ نعیم کو فون کیا — میں نے پولیس کو اطلاع دی — خون بہہ رہا تھا — ان کا سارا لباس خون میں لت پت ہو چکا تھا — خون نے لباس کو سیاہ کر دیا تھا — امتیاز خون سے نہ گھبرائے۔ وہ سید تھے اور سید خون سے کبھی نہیں گھبراتے۔

"میں سنا کرتی تھی، ڈاکٹر اپنے مریضوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے، لاپروائی برتتے ہیں — مگر یہ سب جھوٹ نکلا — میو ہسپتال میں ڈاکٹروں نے امتیاز کی پوری دیکھ بھال کی — بڑی خدمت کی — میں زخمی ہوں — ڈاکٹر میرا علاج کر رہے ہیں — بڑی محبت سے — بڑی احتیاط سے — میں ان کی ممنون ہوں — ان کے بارے میں جو سنا تھا سب غلط نکلا — ڈاکٹر تو اپنے مریض کے لیے جان نچھاور کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں —

"آئیے بہن، آئیے — آپ نے بڑی زحمت کی — ہاں امتیاز شہید ہو گئے — ہتھیار؟ نہیں بہن — ہم ادیب ہتھیار اپنے پاس نہیں رکھتے — قلم ہی ہمارے لیے سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے — امتیاز ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچتے رہتے تھے — وہ تھنکر

تھے — ہر بات کو اچھی طرح سمجھایا کرتے — ہاں بہن — ہم ادیب تو کسی کا دکھ نہیں دیکھ سکتے — ستمبر میں پاک بھارت جنگ ہوئی تو میں موم بتی کی روشنی میں بیٹھ کر اپنی ڈائری لکھا کرتی تھی — وہ شائع ہو چکی ہے — میں نے لکھا تھا — کوئی آدمی خواہ واہگہ سے اس طرف مارا گیا یا اس طرف — جن ماؤں کا بیٹا مرا، ان دونوں کے گھروں میں ایک سا ماتم ہوا — ہمارا ہتھیاروں سے کیا کام — اچھا نہیں — بہت شکریہ — آپ تشریف لائیں — میں اچھی ہو گئی تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوں گی۔ اب تو میں پولیس کے پہرے میں ہوں — آپ دیکھ رہی نا، گیٹ کے پاس پولیس نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں — اچھا بہن۔ خدا حافظ —"

"ہاں — میں کیا کہہ رہی تھی — ستمبر کی جنگ میں لوگوں نے امتیاز کو بہت سمجھایا کہ وہ لاہور سے چلے جائیں — مگر انہیں لاہور سے عشق تھا — وہ لاہور چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتے — مجھے بھی اپنے وطن کے ذرّے ذرّے سے عشق ہے — لاہور سے محبت ہے — میں ۶۵ء سے پہلے اپنے آپ کو اس ملک میں اجنبی محسوس کرتی تھی — جسٹ اے فارنر — مگر جب پاکستان کے لیے جنگ لڑی گئی۔ بھارت نے حملہ کیا تو مجھے اس ملک، اس شہر سے عشق ہو گیا؛ ورنہ میں اس سے پہلے اپنے آپ کو ہمیشہ اجنبی ہی محسوس کرتی رہی۔

فاصلہ — کتنا بڑا فاصلہ تھا جو مٹ گیا — امتیاز کی والدہ نے پنجاب کی مسلمان عورتوں کے حقوق اور آزادی کے لیے بڑا کام کیا — "تہذیب نسواں" میں۔ میری والدہ عباسی بیگم بھی لکھا کرتی تھیں — ہم رہتے تو حیدر آباد دکن میں تھے۔ مگر جب کوئی وبا پھیلتی تو مدراس چلے جاتے — جی ہاں — دکن کی اپنی تہذیب ہے، اپنا معاشرہ ہے — میں نے تہذیب نسواں کے لیے لکھنا شروع کیا — امتیاز بھی اس میں دلچسپی لیتے تھے — تہذیب نسواں کے لکھنے والے دُور دُور رہنے کے باوجود ایک رشتے

میں منسلک تھے۔ سب کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے ۔۔۔ ایک کنبہ تھا جس کے ہم سب افراد تھے ۔۔۔ میری امتیاز سے خط و کتابت تھی ۔۔۔ ایک بار یوں ہوا کہ میں نے امتیاز کو خط لکھا تو انہوں نے اس کا جواب نہ دیا ۔۔۔ دوسرا خط لکھا تو اس کا جواب بہت دیر میں آیا ۔۔۔ تب تک میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اس شخص سے تعلقات منقطع۔ میں کچھ ایسی ہی ہوں، جو فیصلہ کر لیتی ہوں اس پر فوراً عمل کرنے لگتی ہوں ۔۔۔ امتیاز کے کئی خط آئے، میں نے کسی کا جواب نہ دیا ۔۔۔

"پطرس کو تو آپ جانتے ہی ہیں نا ۔۔۔ امتیاز نے پطرس سے ذکر کیا ۔۔۔ پطرس نے امتیاز کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا ڈراما انارکلی شائع کروائیں اور اسے حجاب کے نام معنون کر دیں ۔۔۔

" امتیاز نے 'انارکلی' کو شائع کیا اور اسے میرے نام معنون کر دیا ۔۔۔ مجھے کتاب ملی تو ساری رنجشیں ختم ہو گئیں ۔۔۔ امتیاز کی زندگی میں ہی انارکلی کو کلاسیک کا رتبہ دے دیا گیا تھا ۔۔۔ اور یہ معمولی بات نہیں ۔۔۔ میں اس انتساب کے حوالے سے امتیاز کی ہمیشہ ممنون رہی ۔۔۔

" اور پھر فاصلے مٹ گئے ۔۔۔ سر محمد یعقوب نے میرے والد نواب اسماعیل سے امتیاز کے لیے میرا رشتہ مانگا ۔۔۔ امتیاز بھی بلائے جا چکے تھے ۔ مگر وہ ہمارے ہاں نہ ٹھہرے تھے ۔۔۔ ایک ہوٹل میں رہائش پذیر تھے ۔۔۔ میرے والد نے ملازم سے نقشہ منگوایا اور اپنے میز پر پھیلا کر کہا : " یہ رشتہ نہیں ہو سکتا ۔ کہاں لاہور ۔۔۔ کہاں مدراس ۔۔۔ فاصلہ بہت ہے ۔۔۔ مگر فاصلوں کو تو مٹنا تھا ۔ سر محمد یعقوب نے کہا کہ شمس العلماء ممتاز علی کو میں کیا جواب دوں گا ۔۔۔ اور رشتہ ہو گیا ۔۔۔ میں ایک دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلی آئی ۔۔۔ ایک تہذیب سے دوسری تہذیب کی طرف سفر شروع ہوا ۔۔۔ سر محمد یعقوب نے کہا تھا :

"آپ اب جس علاقے میں جا رہی ہیں۔ اس کی تہذیب اور رسم و رواج کو اپنے اندر رچا لیجیے گا۔"

جب ہم لاہور پہنچے تو کالے برقعے میں ملبوس عورتوں اور سکھوں کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا کہ اتنے سارے مولوی اور ننیں (NUNS) کہاں سے آگئیں — تب امتیاز نے مجھے بتایا کہ یہ ننیں نہیں بلکہ مسلمان برقع پوش عورتیں ہیں اور یہ ڈاڑھیوں والے سکھ ہیں مولوی نہیں —

"میں اس دنیا میں چلی آئی — اپنے آپ کو اجنبی محسوس کرتی رہی — امتیاز نے مجھے کبھی کوئی تکلیف محسوس نہ ہونے دی — اللہ کا دیا سب کچھ تھا — کبھی کوئی کمی محسوس نہ ہوئی — امتیاز روپے پیسے کے معاملے میں بڑے لاپروا تھے — ایک بار سو روپے کا نوٹ جلا دیا — دھوبی کپڑے لاتا تو جیبوں سے روپے نکلتے — وہ ادیب تھے، لکھنے اور سوچنے میں مصروف رہتے تھے —

"میں سوچا کرتی تھی۔ امتیاز کی محبت اور احسانوں کا بدلہ کیسے چکا سکتی ہوں۔ انار کلی کا انتساب میرے لیے بڑا اعزاز تھا — کئی سالوں کے بعد پچھلے دنوں جب میری کتاب "یہ بہاریں یہ خزائیں" شائع ہوئی تو میں نے انار کلی کے انتساب کا جواب دینے کی کوشش کی — یہ میری تازہ کتاب ہے — آپ نے دیکھی ہوگی — اس کا انتساب میں نے انار کلی کے مصنف کے نام کیا ہے اور اس کے نیچے جو جملہ لکھا ہے وہ انار کلی سے لیا گیا ہے — مجھے یہ جملہ بے حد پسند ہے —

"مگر وہ رات بہت حسین تھی — بادلوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے — ہوا چل رہی تھی — پھر بادل جمع ہو گئے اور — میں لکھ چکی ہوں — آپ نے تو پڑھا ہی ہوگا کہ میں جراثیم پر اعتماد رکھتی ہوں — مگر وہ رات — امتیاز شہید

ہیں — وہ سیّد تھے نا — وہ پیارے دنیا سے اٹھ گئے۔"

نوٹ : محترمہ حجاب امتیاز علی کی یہ گفتگو سیّد امتیاز علی تاج کی وفات کے دو دن بعد قلم بند کی گئی تھی۔

(س۔ط)

ایرک ماریا ریمارق

لق و دق صحرا میں انسانی اعضا بکھرے ہوئے تھے ۔ سڑاندھ اور تعفن سے فضا بوجھل تھی ۔ وہ اپنے زخمی جسم کے ساتھ ۔ آہستہ آہستہ رینگتا ہوا ٹیلے کے عقب سے سامنے آیا ۔ نتھنوں میں ریت بھری ہوئی تھی ۔ ہوا کا ذائقہ بھی بدل چکا تھا ۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں ۔ ریت کے ذرے پلکوں پر تھرتھرائے ۔ اس کے آس پاس انسانی اعضا اور لاشیں بکھری ہوئی تھیں ۔ وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے ان اعضا اور لاشوں کو دیکھتا رہا پھر کہیں سے ..... نہ جانے کہاں سے ..... ایک خوب صورت تیتری اڑتی ہوئی آئی ۔ صد رنگ ..... نازک کومل، خوب صورت ..... اور ایک ٹوٹی ہوئی کھوپڑی پر بیٹھ گئی ۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا ..... درد غائب ہوگیا ۔ وہ تیزی سے آگے کھسکا ۔ اور جنونیوں کی طرح تیتری کی طرف بازو لہراتے ہوئے بولا ۔ "چل ..... بھاگ یہاں سے ..... اڑ جا ..... تیرا یہاں کیا کام ہے ؟"

(مغربی محاذ خاموش ہے)

ان مصنفوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جنہوں نے جنگ کی دہشت ، تباہ کاریوں اور HORROR کو حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی گرفت میں لیا ہو ۔ ایرک ماریا ریمارق انہی مصنفوں میں سے ایک تھے ۔ ریمارق ۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء کو سوئٹزر لینڈ میں انتقال کر گئے ۔

پہلی جنگ عظیم نے دنیائے ادب کو دو عظیم ناول دیے — ان ناولوں کو ANTI-WAR ناول کہا جاتا ہے — پہلا ناول بلغاریہ کے عظیم ناول نگار ہیک کا GOOD SOLDIER SHEWIK ہے اور دوسرا ناول ریمارق کا ALL QUIET ON THE WESTREN FRONT ہیک کے ہاں سنگینی اور جنگ کی صورت حال، مزاح، طنز اور انسانی حماقتوں سے جنم لیتی ہے اور ریمارق کے ہاں جنگ کی تباہی، بربادی اور دہشت NAKED TEUTH بن کر سامنے آتی ہے اور قاری جنگ کے HORROR سے دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ "مغربی محاذ خاموش ہے" ریمارق کے الفاظ میں اس "نسل کی کہانی ہے، جسے جنگ نے تباہ کر دیا تھا — خواہ یہ نسل جنگ کے کام آئی یا بموں سے بچ گئی — دونوں صورتوں میں تباہی سے ہمکنار ہوئی"

ریمارق نے خود بھی پہلی جنگِ عظیم میں حصہ لیا تھا — وہ جرمن تھے اور جرمنی کی طرف سے نوجوانی کے "معصوم اور تپتے ہوئے لمحات" میں جنگ میں شریک ہوئے — "مغربی محاذ خاموش ہے" ان کا پہلا ناول تھا — اس ناول کے شائع ہوتے ہی ان کے خلاف ایک محاذ کھل گیا — ۱۹۳۳ء میں نازیوں نے، انہیں جرمنی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ریمارق امریکہ پہلے آئے اور پھر سوئٹزرلینڈ میں رہائش اختیار کر لی — ریمارق نے اپنے پیچھے دس ناول چھوڑے ہیں۔ جن میں "مغربی محاذ خاموش ہے" ان کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی دوسری بڑی تصنیف "لزبن میں رات" سمجھی جاتی ہے —

ریمارق نے ۱۹۵۸ء میں مشہور فرانسیسی اداکارہ پاؤلیت گوڈرڈ سے شادی کی تھی۔

ریمارق نے اپنی زندگی میں ہی عالمی شہرت حاصل کی تھی۔ ان کا ناول مغربی

محاذِ خاموش ہے" کلاسیکی ناول کا درجہ رکھتا ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں (جن میں اردو بھی شامل ہے) میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے (اردو میں عموماً ریمارق کو ریمارک لکھا جاتا ہے، جو غلط ہے، اسی لیے اس کے اصل تلفظ کو برقرار کرنے کی کوشش کی گئی ہے)

ریمارق نے عالمی ادب پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں اور دنیا کے چند بڑے خلاق مصنفوں میں سے ایک ہیں۔

جان ڈاس پیسوس

جان ڈاس پیسوس بھی پچھلے دنوں چل بسے ۔

پیسوس لکھنے والوں کی اس نسل کے آخری امریکی مصنف تھے جو ہمینگوے، فٹز جیرالڈ، شٹین بیک اور فاکنر پر مشتمل تھی ۔۔ ڈاس پیسوس ۴۹ کتابوں کے مصنف تھے جن میں ان کی شاہکار تصنیف U.S.A تسلیم کی جاتی ہے جو TRIOLOGY ہے اور ۱۹۳۶ء میں مکمل ہوئی تھی ۔۔ اس کی پہلی جلد 42 no PARLLEL کے نام سے شائع ہوئی۔ دوسری NINTEEN NINTEEN اور تیسری THE BIG MONEY کے نام سے .....

۔ ڈاس پیسوس سرمایہ داری کے شدید مخالف اور ناقد تھے ۔۔ انہیں ایک طرح سے والٹ وہٹمین کے بعد امریکی عوام کا سب سے بڑا "عاشق" سمجھا جاتا ہے ۔۔ تین ناولوں کا یہ سلسلہ U.S.A اپنے دور کی اہم ترین دستاویز ہے ۔۔ غالباً اسی سے متاثر ہو کر سارتر نے اس زمانے میں کہا تھا کہ "ڈاس پیسوس ہمارے زمانے کا سب سے بڑا مصنف ہے"۔ U.S.A کا دامن بڑا وسیع ہے اور اس کی تکنیک میں ڈاس پیسوس نے ایک انوکھا تجربہ بھی کیا تھا۔ اس تجربے کو ناقد FAMOUS NEWS REEL SECTIONS کے نام سے منسوب کرتے ہیں ۔۔ انہوں نے اپنے اس سہ جلدی ناول میں زندہ لوگوں کی سوانح، اخباروں میں شائع ہونے والے

اشتہاروں کے تراشے، سرخیاں، اور اپنے دور کے مقبول عوامی گیتوں کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ہمکلامی کا وہ مخصوص انداز بھی اپنایا تھا، جو ایک طرح سے — جیمس جوائس کا اسلوب تھا۔ U.S.A کو "سماجی واقعیت نگاری کا شہکار" تسلیم کیا جاتا ہے — یہ ناول ایک بہت بڑی پکچر گیلری کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں جیتے جاگتے کروڑپتی، طوائفیں، دکانوں میں کام کرنے والی عورتیں، دہقان لڑکے، شہری آوارہ گرد اور غنڈے، ملاح، درزی اور ہر طرح کے لوگ، ایک سرمایہ دارانہ نظام میں جکڑے اور پھنسے ہوئے نظر آتے ہیں۔ U.S.A کی اشاعت نے امریکہ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

جان ڈاس پیسوس شکاگو کے ایک ہوٹل کے کمرے میں پیدا ہوئے اور عمر کا ابتدائی حصہ ہوٹلوں میں ہی گزرا — ان کی والدہ عموماً حالتِ سفر میں رہتی تھیں۔ اس لیے پیسوس نے بھی بچپن میں یورپ کے کئی ملک دیکھ ڈالے۔ کالج کے زمانے میں انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر وہ فرانس چلے گئے ہمینگوے کی طرح ایمبولینس ڈرائیور کی حیثیت سے انہوں نے پہلی جنگِ عظیم میں حصہ لیا۔ مگر جلد ہی ان کو فوج سے نکال دیا گیا، کیونکہ ان کے نظریات جنگ کے خلاف تھے۔ اس کے بعد انہوں نے تصنیف کا کام شروع کیا۔ وہ انتہا پسند تھے اور امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کے سخت خلاف — ۱۹۳۶ء میں پیسوس نے ایک انٹرویو کے دوران کہا تھا:

"میری آخری امید انقلاب ہے — مکمل جدال، قتل، تمام سیاستدانوں کا قتل، سرمایہ داروں، جنگ پسندوں، تخریبی عناصر، جنگی ایجادات کرنے والے سائنسدانوں کا قتل..... اس تمام مشینری کا قتل جس نے یہ سرمایہ دارانہ [illegible] نظام قائم کر رکھا ہے —"

عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات کی انتہا پسندی دھیمی پڑتی گئی۔

اور بالآخر ان کے تمام انقلابی اور انتہا پسندانہ نظریات "آزاد خیالی تک محدود ہو کر رہ گئے۔

۱۹۲۵ء میں انہوں نے ہفتے کے سات دنوں میں ہر روز لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دن تک اس منصوبے پر عمل کرتے رہے۔

ڈاس پیسوس کی انتالیس تصانیف ناولوں، کہانیوں، مضامین، نظموں، سفرناموں اور مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ ان تصانیف میں ان کا سہ جلدی ناولوں کا سلسلہ U.S.A اور ایک ناول MAN HAT TON TRANSFER ہمیشہ زندہ رہنے والی کتابیں ہیں۔

جان ڈاس پیسوس (۱۸۹۶ — ۱۹۷۰) چوہتر برس جیئے۔

سیّد عابد علی عابد

نصف گھنٹہ پہلے "پنجدریا" والے چوہدری محمد افضل خان کا فون آیا تھا۔ میں نے شام چھ بجے ان کے ہاں آنے کا وعدہ کیا اور پھر کام میں الجھ گیا۔ چھ بجنے میں ابھی دو ڈھائی گھنٹے پڑے تھے ۔۔ نصف گھنٹہ گزرا بھی نہ ہوگا کہ چوہدری محمد افضل خاں، عبدالمجید بھٹی کی معیت میں میرے پاس آ گئے ۔۔ میں نے ہنس کر کہا:

"آپ نے بہت تیزی دکھائی۔ میں تو چھ بجے آپ کی طرف آنے والا تھا"

چوہدری صاحب نے کہا:

"جنازہ ابھی نہیں آیا، اس لیے میں یہاں آ گیا ہوں"

میں کچھ کہہ بھی نہ پایا تھا کہ عبدالمجید بھٹی صاحب نے کہا:

"عابد علی عابد انتقال کر گئے ہیں ۔۔ ان کا جنازہ آنے والا ہے"

میں کچھ بول نہیں سکا ۔۔ چپ لگ گئی ۔۔

ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں ۔۔ میں سنتا رہا ۔۔ مگر میرے اندر ۔۔ کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا ۔۔ عابد صاحب مر گئے ۔۔ عابد صاحب مر گئے ۔۔

چوہدری محمد افضل خان اور عبدالمجید بھٹی چلے گئے اور پھر میں بھی دفتر سے باہر نکل کر سڑک پر آ گیا ۔۔ قبرستان کے سامنے کچھ لوگ کھڑے تھے ۔۔ جنازے کا انتظار ہو رہا تھا ۔۔ میرا ذہن ماؤف تھا ۔۔ اچھا تو عابد صاحب مر گئے ۔۔

ایک دکان میں میرزا ادیب، صوفی تبسم، حبیب کیفوی، شیخ عبدالسلام بیٹھے تھے۔ جنازے کا انتظار ہو رہا تھا — میرزا ادیب اُٹھ کر باہر آ گئے — انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں میرے ہاتھ کو تھاما — اور آہستہ سے بولے :

"پُرانی نسل کا ایک اور بڑا شاعر دنیا سے اُٹھ گیا —

میں نے آسمان کی طرف دیکھا — گدلا آسمان — بارش کے لیے کئی دنوں سے شہر کے کئی روزناموں میں دعائیں شائع کی جا رہی تھیں — بارش کی شدید ضرورت تھی اور بارش تھی کہ ہو نہ رہی تھی، آسمان گدلا تھا — جنازہ ابھی نہیں آیا تھا اور ہم بارش کے لیے ترس رہے تھے — "پرانی نسل کا ایک اور بڑا شاعر دنیا سے اُٹھ گیا —"

شہزاد احمد اور اقبال ساجد سڑک کے اس پار کھڑے ہیں۔ میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں — شہزاد احمد تازہ فنون کی ورق گردانی کر رہے ہیں — وقت کٹنے کے لیے — جنازہ نہیں آیا —

"مجھے جی۔ او۔ آر اسٹیٹ میں گھر نہیں ملا، جنازہ وہاں سے اُٹھے گا —"

میں نے شہزاد احمد کی بات سنی اور دل میں کہا — "اچھا تو عابد صاحب — ساگر روڈ پر نہیں تھے — ان کا انتقال جی۔ او۔ آر اسٹیٹ میں ہوا —" شہزاد کہتے ہیں :

"خوب آدمی تھے — عابد صاحب —"

میں چپکے سے کھسک گیا ہوں اور گدلے آسمان کے نیچے سڑک ناپنے لگتا ہوں — عابد صاحب انتقال کر گئے — میرے دل میں پھر کوئی آہستہ سے بولا ہے۔

جنازہ تاج صاحب کے گھر سے اُٹھ چکا تھا — ہم سب جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے — جنازے کے ساتھ چلنے والوں میں مَیں نے عابد صاحب کو

دیکھا — گوہر نوشاہی ان کے ساتھ لپٹا ہوا آنسو بہا رہا تھا — عابد صاحب کی آنکھیں خشک تھیں — مگر پیلے کمزور چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی — وہ گھمنٹ رہے تھے — دوست کے دُکھ میں نڈھال — وہ جنازے کے ساتھ چل رہے تھے۔ ان کے چہرے پر موت کھنڈی ہوئی تھی — اور دوست کی موت کا دکھ سہہ رہے تھے — یہ عابد صاحب کی آخری جھلک ہے جو میرے ذہن میں محفوظ ہے —

آج وہ اسی قبرستان میں دفنائے جا رہے تھے جہاں ان کے دوست اور رفیق "تاج صاحب" دفن ہیں —

آسمان گدلا ہے۔ بادلوں کی کوئی تصویر نہیں بنتی — میں ایک چکر لگا کر قبرستان کے سامنے سے گزرا ہوں — ابھی جنازہ نہیں آیا — عابد صاحب کا جنازہ —

رشیدہ سلیم سیمیں کے مجموعے "چشم خون بستہ" کی قومی کتاب مرکز میں تقریب تھی۔ وہ خود راولپنڈی سے نہ آ سکی تھیں — عابد صاحب "چشم خون بستہ" پر تبصرہ کر رہے تھے — زبان و بیان کی غلطیاں نکال رہے تھے۔ ان کا محاکمہ بڑا جاندار اور عالمانہ تھا — بات کو ختم کر کے وہ بیٹھ گئے — مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ان کا سانس پھول رہا تھا — یہ آخری موقعہ تھا، جب میں نے ان کے منہ سے علم و فضل اور ادب و زبان کی باتیں سُنیں — اب وہ زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھی —

وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ ان کی صحت کو گھن لگ چکا تھا۔ دیال سنگھ کالج کی پرنسپلی چھوٹ جانے، مقدمات میں ملوّث ہونے کے بعد، ان کی زندگی کا چلن بدل گیا تھا — مشرق کی عظیم کلاسیکی شاعری کا یہ ناقد اور غواص زندہ رہنے کے لیے پناہیں ڈھونڈ رہا تھا — "شبِ نگار بنداں" اور "بریشم و عود" کا شاعر منشیات کا عادی ہو رہا تھا — صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی — وہ اپنے ہی ایک مصرعے

کی تصویر بن گئے تھے۔

ع   مرنے کے بڑے جتن کیے ہیں

اسی زمانے میں ایک چلچلاتی دوپہر میں وہ غش کھا کر مال روڈ پر گر پڑے۔ اتفاق سے میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ انہیں گرتے دیکھا تو بھاگا۔ لوگ باگ جمع ہو چکے تھے — جلدی سے انہیں اٹھا کر ریڈیو کی ایک دکان میں پہنچایا۔ پانی منہ پر چھڑکا تو انہیں کچھ ہوش آیا۔ بہت نڈھال ہو چکے تھے — جب ٹیکسی پر سوار کرا کے میں انہیں ان کے گھر پہنچانے کے لیے لے گیا تو سارا راستہ تقریباً خاموش رہے — گھر کے قریب انہیں اتار کر میں نے الوداع کہا۔ تو انہوں نے بھنسی بھنسی آواز میں مہذب لہجے میں میرا شکریہ ادا کیا اور پھر میں چلا آیا۔ اصل میں مجھے ان سے کبھی قربت نہ رہی تھی۔ معمولی سی صاحب سلام تھی۔ وہ بھی نیازمندانہ۔ ان سے بات کرتے جھجک محسوس ہوتی تھی — یہ جھجک اب بھی برقرار ہے — کیونکہ وہ جن علوم پہ دسترس اور عبور رکھتے تھے ان پر میرا مطالعہ واجبی ہے۔

ویسے وہ آل راؤنڈر تھے۔ شعر انہوں نے کہے — ترجمے انہوں نے کیے۔ تنقید انہوں نے لکھی — ناول انہوں نے لکھے اور افسانے، ڈرامے، فیچر اور خاکے بھی۔ ماہر تعلیم وہ تھے اور پرچوں کے مدیر وہ رہے — میں تو ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی رہا — طالب علم کی حیثیت میں — کبھی سید قاسم محمود صاحب سے ان کا ذکر نکلتا تو وہ ان کے دیرینہ رفیق ہونے کے ناطے سے ان کی باتیں سناتے اور میں کہہ دیتا:

شاہ جی، اور تو سب کچھ ٹھیک ہے مگر عابد صاحب کسی میدان میں ٹکے نہیں۔ "جیک آف آل ٹریڈز ماسٹر آف نن" بن کر رہ گئے۔"

جنازہ ابھی نہیں آیا تھا اور میں گدلے آسمان کے نیچے سڑکیں ناپ رہا تھا۔

اور عابد صاحب کے بارے میں کتنی ہی باتیں میرے ذہن میں آ رہی تھیں۔ وہ سب کچھ پڑھتے تھے : حتیٰ کہ ایک بار میں نے انہیں ریگل کے پاس کتابوں کی ایک بھن سپیس ایچ پر آیان فلیمنگ کی جیمز بانڈ سیریز کو خریدتے دیکھا۔ جب بھی میں نے اپنی جھجک کے ساتھ کہا تھا :

"عابد صاحب' آپ یہ کتابیں بھی پڑھتے ہیں ؟"

انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ اپنے مہذب لہجے میں کہا تھا ·

"ہاں — میاں ' وقت گزارنے کے لیے —"

اپنی زندگی کی کلفتوں ' ناکامیوں اور پریشانیوں سے پناہ ڈھونڈتے ہوئے وہ جیمز بانڈ کے کارنامے بھی پڑھتے تھے اور ٹیکہ بھی لگواتے تھے — انہوں نے پناہ ڈھونڈ لی تھی — دراصل وہ اب اپنی زندگی ہی گزار رہے تھے — ان کا ایک شعر ہے :

واعظ شہر خدا ہے' مجھے معلوم نہ تھا
یہی بندے کی خطا ہے' مجھے معلوم نہ تھا

واعظ شہر کے خدا بننے اور بندے کی خطا کے شعور کے ساتھ ساتھ وہ زندہ تھے مگر اس فلسفے کے ساتھ —

دل باختگی و شعر خوانی
دو کام تو عمر بھر کیے ہیں'

عابد صاحب کا یہ شعر ان کی زندگی اور طرز زیست کا مکمل اظہار کرتا ہے —
"دل باختگی" اور "شعر خوانی" ان کی زندگی کی دو ناگزیر خصوصیات بن گئی تھیں۔ ان اعمال نے ان کو زندگی کے ساتھ مربوط بھی کیا تھا اور زندگی سے کاٹ بھی دیا تھا۔ اور اسی لیے وہ آخری عمر میں پناہیں تلاش کرتے رہے۔ اپنی ذات میں پناہ لے کر آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھتے رہے — مجھے ان کا ایک شعر یاد آ رہا ہے :

میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
ان کے مرنے کا نام تاج محل

بس یہی ان کی زندگی کا آخری دور تھا ـــــ سیج کانٹوں کی ـــــ شاید وہ بھی بارش کی تمنا میں جیتے رہے ـــــ گدلے آسمان کے نیچے سسکتے رہے ـــــ اور آج ان کی موت کی شام ـــــ آسمان پھر گدلا تھا ـــــ

ایک زمانے میں انہوں نے پیری لوئی کے شاہکار ناول الیفرو ڈائتیٔ کا ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمے نے ان کی زبان دانی اردو اور فارسی پر عبور کی سند مہیا کی تھی ـــــ اس ترجمے سے میں نے بہت کچھ سیکھا ـــــ ترجمے کا فن اس بلندی پر اردو زبان میں کم ہی پہنچا ہے ـــــ مگر جب انہوں نے دل ڈیوراں کی تصنیف "سٹوری آف فلاسفی" کا ترجمہ کیا اور میں نے پڑھا تو مجھے جانے کیوں مایوسی ہوئی ـــــ میرے دل نے کہا تھا: عابد صاحب نے اپنے معیار کو برقرار نہیں رکھا تھا ـــــ کلاسیکی اسلوب اور معنی آفرینی سے چھلکتی ہوئی غزلیں پڑھ کر ـــــ ان کے مخصوص شعری اسلوب اور آہنگ سے مرعوب ہونے کے ساتھ ساتھ پچھلے پانچ چھ سالوں میں ان کی کہی ہوئی غزلوں کو پڑھ کر ـــــ مجھے احساس ہوتا رہا کہ عابد صاحب کی گرفت ڈھیلی ہو گئی ہے ـــــ گداز کی آنچ تو تیز ہو گئی ہے مگر ـــــ اس مگر کو عابد صاحب نے خود ہی اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے ؎

کیا بنے صورتِ اظہارِ معانی کہ خیال
ابھی الجھا ہوا الفاظ کے پیچاک میں ہے

دراصل عابد صاحب خود الجھتے چلے جا رہے تھے ـــــ اپنی ذات کے ساتھ، بندے کی خطا کے جان لیوا شعور کے ساتھ ـــــ اور آسمان گدلا ہوتا جا رہا تھا ـــــ صورتِ اظہارِ معانی میں الجھنیں پیدا ہو رہی تھیں۔ نقاش کے نقش ادھورے رہنے لگے

تھے اور صنم خانے میں آذر کے ہاتھوں میں تیشہ کانپنے لگا تھا۔

میں ایک لمبا چکر لگا کر پھر قبرستان کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ ریاض جاوید مل گئے ہیں — اِدھر اُدھر کی باتیں چل نکلی ہیں — وہ ظفر احسن ایبک کی خود نوشت کا ذکر کرنے لگے ہیں — باتوں باتوں میں وہ کہتے ہیں :

"ظفر احسن کی زبان بڑی خراب ہے — کتاب انتہائی اہم ہے مگر زبان و بیان کی خامیوں نے بیڑہ غرق کر دیا ہے — وہ اپنی کتاب پر عابد علی عابد سے نظر ثانی کروا لیتے تو ......"

عابد صاحب کی موت کا صدمہ زیادہ گہرا ہو گیا ہے — شہر میں — علم و ادب کی اقلیم میں اب کتنے لوگ ہیں جو ہماری خامیوں کو صحیح کر سکتے ہیں — پرانی نسل کے وہ فاضل اب کتنے رہ گئے جو علم و فن کی باریکیوں، زبان کی تہذیب کا سچا اور گہرا شعور رکھتے ہیں — اب ہم کس کے پاس جا کر اپنے ان مسائل کا حل پوچھا کریں گے — عابد صاحب تو مر گئے —

آسمان اور گدلا ہو گیا ہے — میں قبرستان کی طرف تیزی سے بڑھتا ہوں — جنازے کی نماز پڑھی جا چکی ہے — عابد صاحب کو لحد میں اُتارا جا رہا ہے — میں چپکے سے قبرستان سے باہر نکل آتا ہوں — شام گہری ہو چکی ہے۔ آسمان ویسے ہی گدلا ہے — میری آنکھیں نم ہو رہی ہیں —

دمِ رخصت وہ چپ رہے عابدؔ
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

مولانا غلام رسول مہر

مَوْتُ العَالِمِ مَوْتُ العَالَمِ

فرانس کے ناول نگار فرڈیننڈ سلینی کی ایک پریس کانفرنس میں دنیا بھر کے اخبار
کے نامہ نگار جمع تھے۔ سلینی نے ان کو ایک نظر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا:

"کیا یہ افسوس ناک صورتِ حال نہیں ہے کہ میں 'ایک' ہوتے ہوئے
بھی تم سب سے 'زیادہ' ہوں اور تم 'کئی' ہوتے ہوئے بھی مجھ 'ایک'
سے تھوڑے ہو۔"

مہر صاحب کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔ اور وہ منوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے ہمیشہ کی نیند
سو رہے ہیں اور اپنے پیچھے یہی 'افسوس ناک' صورتِ حال چھوڑ گئے ہیں کہ وہ 'اکیلے'
ہم سب سے 'زیادہ' تھے۔ اور ہم سب مل کر اُن 'ایک' سے کم ہیں...... اور وہ
دنیا سے اُٹھے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ ایک دنیا اٹھ گئی ہے۔ ایک
'عالم' کو موت آ گئی ہے۔

وہ مہر جن کے بارے میں مرحوم عبد المجید سالک نے اپنی "سرگزشت" میں لکھا
تھا:

"واپس لاہور آیا تو سب سے پہلے دفتر 'زمیندار' میں گیا۔ جہاں اُن صاحب سے
ملاقات ہوئی جن کو غلام رسول مہر کہتے ہیں اور جن کی رفاقت و محبت ۱۰ نومبر ۱۹۲۲ء
سے لے کر الی الآن شاملِ حال ہے اور جن کو میں ان نعمتوں میں سے سمجھتا ہوں کہ جن کی وجہ

ت یہ دکھ بھری زندگی قابلِ برداشت رہی — دیکھتا کیا ہوں کہ ایک زمیندار قسم کا آدمی کھدر کا کرتہ پاجامہ اور صدری پہنے اور ایک کھردرا سا چار خانہ کمبل اوڑھے بنچ پر بیٹھا ہے …… ہم جلد ہی بے تکلف ہو گئے اور چند ہی ملاقاتوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ زمیندار قسم کا آدمی فارسی اور عربی سے بدرجۂ اتم واقف ہے — فلسفہ، تاریخ اور دینیات کے مطالعے میں بے حد شغف رکھتا ہے اور ادب و شعر میں بھی مذاقِ سلیم کا سرمایہ دار ہے ۔ (صفحہ ۱)

یہ مہر صاحب کوٹھی میں رہے — اچکن، شلوار اور کرتہ پہنتے رہے ۔ مگر اندر سے وہ دہقان ہی تھے — ایک دہقان کی سی محنت اور محبت کے ساتھ ادب، صحافت، اور تحقیق کی زمین میں قلم سے ہل چلاتے، بیج بوتے، سینچائی کرتے اور فصل کاٹتے رہے — اپنے کام کے ساتھ ان کا انہماک اس درجے بڑھا ہوا تھا کہ ان کی "سماجی زندگی" ان کی زندگی ہی میں ختم ہو چکی تھی — بہت کم گھر سے باہر نکلتے — لکھنا پڑھنا ان کی زندگی تھا اور وہ آخری وقت تک اپنا یہ فرض ادا کرتے رہے — مہر صاحب ایک نہیں تھے، وہ کئی تھے — صحافی، محقق، انشا پرداز، شاعر، مترجم، ماہرِ دینیات، مورخ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا وجود اتنا بابرکت تھا کہ وہ دوسروں کے دکھ بانٹ لیتے تھے اور اپنی عظمت اور بزرگی کا احساس کبھی نہ ہونے دیتے تھے۔

اس زمانے میں جب میں ذہنی طور پر اکھڑا ہوا تھا اور "عقلیت پسندی" کا دورہ پڑا ہوا تھا، میں نے اپنی فکری ژولیدگی اور انتشار کو دور کرنے کے لیے مذہب کے بارے میں کئی علماء اور کئی دانشوروں کو خط لکھے۔ کسی نے جواب ہی نہ دیا، کسی نے ملاقات کے لیے وقت دیا تو میرے سوالات کو مذاق میں ٹال دیا اور میں جو پیاسا تھا، پیاسا ہی رہا۔ اسی زمانے میں میں نے مہر صاحب کو خط لکھا — مجھے امید نہیں تھی کہ وہ جواب دیں گے میں نے اپنے خط میں اس بات پر بڑا اصرار کیا تھا کہ وہ مجھ سے کب ملاقات کریں گے؟

اور ملاقات کے لیے کتنا وقت دیں گے — دوسرے دن مجھے اُن کا خط مل گیا۔ انہوں نے پوسٹ کارڈ کے دونوں طرف بڑی تفصیل سے میرے خط کا جواب دیا تھا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے — انہوں نے لکھا تھا :

۱۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

باسمہٖ سبحانہٗ

مکرمی: میں تو ایک معمولی سا طالب علم ہوں — علم فرومایہ اور فکر و نظر محدود۔ میں آپ کی کیا خدمت انجام دے سکوں گا — مبادا آپ فرمائیں کہ میں ٹال رہا ہوں۔ آپ کو جب سہولت نظر آئے تشریف لے آئیں۔ میرے لیے سہولت اس میں ہے کہ عام دنوں میں آنا ہو تو شام کے بارہ بجے کے قریب آئیں۔ ہفتے کو میرا گھر پر رہنا یقینی نہیں ہوتا۔ اگر دقت نہ ہو تو اتوار کو نو دس بجے کے قریب آجائیں۔

بہرحال اپنی سہولت مقدم رکھیں۔ میں صبح سیر کو نکل جاتا ہوں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس میں صرف ہو جاتا ہے — دوپہر کا کھانا کھا کر سو جانے کی عادت ہے — اگر آپ کے لیے انہی اوقات میں سے کوئی وقت باعث سہولت ہو تو صرف مطلع فرما دیجیے — میں اپنی عادتوں کو آپ کی مصلحتوں کے تابع رکھوں گا —

ابتدا میں جو کچھ عرض کیا ہے، یہ کسرِ نفسی نہیں۔ حقیقت ہے اور مختلف احباب کو دورانِ مطالعہ میں جن خاص مسائل سے سابقہ پڑا، انہیں سُننے اور سمجھنے کا شوق ہمیشہ رہا۔ اگرچہ خود میرا طریقِ حلِ مسائل عام اصحاب سے الگ ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ وہ خود مسائل کو پیچیدہ بناتے ہیں۔ پھر ان کو حل نہ کر سکنے پر متاسف رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں

خصوصاً اسلام کے بارے میں بنیادی تصور کا ہے ۔
امید ہے آپ بخیر ہوں گے — یاد فرمائی کے لیے ممنون ہوں —
والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

نیاز مند مہر

انہوں نے جس کمال مہربانی سے مجھے یہ لکھا تھا کہ "میں اپنی عادتوں کو آپ کی مصلحتوں کے تابع رکھوں گا" اسے میں تا عمر نہیں بھول سکتا اور جب میں انہیں ملنے گیا تو وہ کافی دیر تک میری ذہنی الجھنوں کو سلجھاتے رہے اور بہت حد تک انہوں نے میری تشفی بھی کر دی — اُس تمام گفتگو میں، جس میں ان کا لب ولہجہ بڑا اکھڑ اور دیہاتی سا تھا، وہ مجھے ایک شفیق باپ کی طرح نظر آئے، جو ایک گم کردہ راہ بیٹے کو راہ راست پر لانا چاہتا ہے — اور اس کے لیے اس پر کچھ ٹھونستا نہیں۔ اس کو مجبور نہیں کرتا — جب بات اسلام کے بنیادی تصور کے بارے میں چلی تو انہوں نے ایک جملہ کہا جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا :

"خدا ایک، رسول ایک، کتاب ایک، امت محمدیؐ ایک، ایک میں سب کچھ ہے — 'ایک' چاہے تو اپنے اندر سب صفات پیدا کر سکتا ہے"

اور اب جو مہر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ وہ 'ایک' تھے اور ہم ایک نہیں ہیں — اسی لیے وہ ہم سب پر بھاری رہے اور بھاری رہیں گے ۔

مہر صاحب 'ایک' تھے۔ اسی لیے وہ دوسروں کو اپنا بنا لیتے تھے۔ ان کا ملازم خاص 'ننکورام' مہر صاحب کی شخصی وحدت اور اکائی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے اگر مہر صاحب [illegible] ہوتے تو ننکورام، اپنے بیٹے، اپنی برادری سے دور کیوں رہتا [illegible]

بڑائی 'ننکورام' میں بھی ہے۔ مگر جذب کرنے کی ساری صلاحیت اور 'وحدت' تو مہر صاحب کی شخصیت میں تھی کہ انہوں نے ننکورام کو اس طرح اپنایا کہ وہ مہر صاحب ہی کا ہو کر رہ گیا۔

ان کے عمل اور کردار میں یہی "ایکتا" پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی 'اکائی' کو اس طرح سمیٹے ہوئے تھے کہ جب یہ اکائی پھیلتی تو علم و ادب اور صحافت کی سرحدیں ان کے سامنے سمٹ کر رہ جاتی تھیں اور وہ ان سب پر چھا جاتے تھے۔

قومی کتاب مرکز میں وہ ایک کتاب کے تعارفی جلسے میں مضمون پڑھنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ جلسہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے اُٹھ کر کہا:

"نماز کا وقت ہو گیا ہے، پہلے نماز پڑھ لیجیے۔"

وہاں اور بھی "بہت" تھے مگر مہر صاحب تو "ایک" ہی تھے، اس لیے یہ بات وہی کہہ سکتے تھے۔ وہ نماز پڑھنے کے لیے اُٹھے.... تو کئی ان کے ساتھ چل دیے۔ مقناطیس کی طرح۔ جو ایک ہوتا ہے اور کئی چیزوں کو بیک وقت اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ بالکل اسی طرح ہوا۔

مہر صاحب نے خلوت میں جلوت کا سماں باندھ رکھا تھا۔ کتابیں، کاغذ اور لکھنا۔ دہقان کی طرح صبح اُٹھ کر فطرت کا نظارہ کرنا، پھر ادب کی بنجر زمین میں سچے لفظ کا بیج بونا اور فصل اٹھنے کا انتظار بے نیازی سے کرنا۔ وہ اس دہقان کی طرح تھے جس کے سامنے اصل مقصد سچے دل سے بیج بونا، نلائی کرنا اور زمین کو نمو کی بالیدگی دینے سے زیادہ کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی اور جب بیج اتنے خلوص سے بویا جائے تو پھر فصل ضرور اُگتی ہے، بیج رائیگاں نہیں جاتا۔

اور مہر صاحب نے جو لفظ لکھا وہ سچا تھا۔ خواہ وہ زمیندار کے اداریے تھے یا انقلاب کے اداریے۔ خواہ غالب پر ان کا کام ہو، سید احمد شہید، سرگزشت

مجاہدین ہو یا جماعتِ مجاہدین اور خواہ ان کے تراجم — وہ لفظ جو ان کتابوں کے صفحوں میں بوتے گئے ہیں، ہمیشہ ذہنوں کی آبیاری کرتے رہیں گے اور پھیل لاتے رہیں گے، لیکن ان لفظوں کو 'بونے' والا دُنیا کے 'جلسے' سے اُٹھ چکا ہے۔ 'نماز' کا وقت ہو چکا تھا۔ اگرچہ — یہ نمازِ جنازہ تھی — اب بھی وہ 'ایک' کی صورت میں تھے اور نمازِ جنازہ پڑھنے والے کئی.....

موت العالم!

عالمی ادب کا نیا هیرو

یوکیو مشیما

اپنی زندگی کے پینتالیس سال تک جاپان کے ناول نگار اور ڈراما نویس یوکیو مشیما نے اپنے عہد کے چیلنج کو جاپان کے قدیم سمورائی (جاپان کا ایک لیجنڈ۔ محب وطن جانباز) کی طرح قبول کیا اور اس سے عہدہ برآ ہوا تھا۔ اس کی موت بھی لیجنڈ کے مطابق تھی۔ اس نے ۲۵ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ہارا کاری (جاپان کا روایتی انداز خودکشی) کر کے اپنے آپ کو "عالمی ادب کا نیا ہیرو" ثابت کر دیا۔

اپنی زندگی کے پینتالیس سالوں میں مشیما نے بیس ناول، تینتیس ڈرامے، ایک سفرنامہ اور اپنی [illegible] زندگی کی داستان لکھیں۔ جاپان کے ادب میں اس کا مرتبہ جاپانی نوبل انعام یافتہ [illegible] یاسوناری کو تو [illegible] نہیں، بلکہ مشیما کے بارے میں یہ سمجھا جاتا [illegible] درحقیقت جاپانی ادب میں وہ واحد فن کار تھا جو نوبل انعام کا مستحق تھا۔

مشیما نے ایک بھرپور منفرد اور متنوع زندگی گزاری۔ وہ جاپان کا ہمینگوے سمجھا جاتا رہا ہے۔ وہ بہت اچھا گویا تھا اور اس نے سٹیج پر کئی بار گانے کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنی زندگی میں کئی فلمیں پروڈیوس کیں اور خود بھی ان میں اہم کردار ادا کیے۔ اسے جسمانی مقابلوں، کسرت اور سیر و تفریح سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ ویٹ لفٹنگ کرتا تھا اور

شمشیر زنی میں جاپانی قدیم محب الوطن سمورائی روایت کا زندہ ثبوت تھا۔ اس نے شمشیر زنی کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی — متنوع، رنگا رنگ اور بے پناہ جذبوں سے بھرپور زندگی گزارنے کے باوجود وہ تخلیقی اوہام کا شکار تھا — یہ "اوہام" اُسے زمانے کے تضادات نے دیے تھے۔

نومبر ۱۹۷۰ء کے آخری ہفتے میں مشیما نے اپنے آخری ناول "زرخیزی کا سمندر" کا مسودہ اپنے پبلشر کو بھیجا تھا — اس کا یہ ناول چار جلدوں پر مبنی ساگا ہے۔ اس ناول کی حیثیت جاپان کی تہذیب کے عروج و زوال اور تاریخی اتار چڑھاؤ کی تخلیقی دستاویز سے کم نہیں — اس کی پہلی جلد کا آغاز ۱۹۱۲ء سے ہوتا ہے اور اختتام ۱۹۷۰ء میں۔ مشیما نے اس ناول کے بارے میں مسودے کے ساتھ اپنے پبلشر کو جو خط بھیجا وہ بہت اہم حیثیت رکھتا ہے — مشیما لکھتا ہے:

"اس ناول میں میں نے ہر بات کہہ دی ہے — میں نے زندگی کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا اور جو غور و فکر کیا ہے وہ سب کچھ لکھ دیا ہے —— مجھے جو کچھ کہنا تھا اس ناول میں کہہ چکا ہوں — اب میں تجربہ کر چکا ہوں اور میرے ذہن میں کوئی بات باقی نہیں رہی —"

ناول کا مسودہ پبلشر کو بھیجنے کے بعد مشیما اپنی زندگی کے آخری کام کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ہمیشہ سے اپنی موت کے بارے میں عجیب و غریب نظریے رکھتا تھا اور موت کا وہم اس پر ہمیشہ سوار رہتا تھا۔

اس نے اپنی زندگی میں ایک چھوٹی سی عسکری تنظیم قائم کی تھی — اس کا نام "الٹرا نیشنلسٹک پیرا ملٹری شیلڈ سوسائٹی" تھا۔ یہ ایک طرح سے اس کی ذاتی فوج تھی جو سو سپاہیوں پر مشتمل تھی — اس نے اپنی فوج کو خود تربیت دی تھی — ان

کو سلم کیا تھا۔ انہیں جو وردی پہنائی جاتی، وہ بہت قیمتی تھی اور اس کا ڈیزائن خود مشیما نے تیار کیا تھا۔ عام جاپانی اس فوج کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے کہ یہ ہمارے ملک کے خلاق ترین انسان کی دلچسپی کی ایک چیز ہے؛ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ مشیما اپنی ابتدائی زندگی اور ابتدائی تحریروں میں ہی اپنے نظریات کو پختہ کر چکا تھا۔ امریکہ کے حوالے سے دوسری جنگِ عظیم کے ساتھ جو اخلاقی، تہذیبی اور روحانی زوال جاپان میں پیدا ہوا تھا، اُس نے مشیما کو مغربی مادیت سے متنفر کر دیا تھا اور وہ جاپان کی موجودہ صورتِ حال سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ ایک سچا، راسخ العقیدہ محبّ الوطن سمورائی تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکیوں نے جاپان پر جو دستور تھوپ دیا تھا، وہ اس کی تنسیخ چاہتا تھا۔ وہ جنگ سے پہلے کے منشور کا حامی تھا۔ اور شہنشاہیت کی بحالی کا زبردست پرچارک تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا، جاپان نے دوسری جنگِ عظیم میں جو ذلت آمیز شکست اٹھائی، اس کا داغ دھونے کے لیے شہنشاہیت کی بحالی اور قدیم جاپانی تہذیبی اقدار کا احیاء ناگزیر تھا۔

مشیما فوجی انقلاب کے لیے کوشاں تھا۔ پچھلے سال وہ کئی فوجی چھاؤنیوں میں گیا، تاکہ جاپانی فوجیوں کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔ اسے اس مقصد میں بہت کم کامیابی ہوئی۔

چھ دسمبر کو وہ اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ "ایسٹرن گراؤنڈ سیلف ڈیفنس فورسز" کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہوا۔ یہ ایک چمکیلا دن تھا۔ سنہری دھوپ نے ٹوکیو کے آسمان پر چھائی ہوئی دُھند کو چاٹ لیا تھا۔ مشیما اپنی زندگی کو شمشیر زن جانباز سمورائی کی طرح انجام تک پہنچانے کا عہد کر کے آیا تھا۔

وہ اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ جنرل کے دفتر میں داخل ہوا اور اس نے تلوار نکال کر جذباتی انداز میں جنرل سے پوچھا:

"تلوار چمکدار ہے نا؟"

جنرل سمجھا کہ مشیما اس سے مذاق کر رہا ہے۔ مگر مشیما مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ جنہوں نے پلک جھپکتے میں جنرل کو رسیوں سے جکڑ کر کرسی سے باندھ دیا — جب جنرل کے فوجیوں نے محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے تو بھاگتے ہوئے آئے مگر مشیما کے ساتھیوں نے آٹھ فوجیوں کو تلوار اور خنجر سے زخمی کر دیا — ان سب کو کمرے میں بند کر کے مشیما اور اس کے ساتھی بالکنی میں پہنچے — بارہ سو کے لگ بھگ جاپانی سپاہی گراؤنڈ میں جمع ہو گئے۔ مشیما نے بالکنی میں کھڑے ہو کر ان سے خطاب کرنے کی کوشش کی — اس وقت مشیما نے جاپان کے دوسری جنگِ عظیم کے جیالے ہوائی گوریلوں (KAMIKAZE) جیسا لباس پہنا ہوا تھا — اس نے تقریر شروع کی — مگر اس کے الفاظ ہوا میں بکھر گئے — فوجی اس حادثے کے بارے میں چہ میگوئیوں میں مصروف تھے — مشیما نے چیخ کر کہا:

"میری بات سنو! میں پچھلے چار سالوں سے بے کار اس امید میں جی رہا ہوں کہ تم ہتھیار اٹھاؤ گے — کیا تم جانباز نہیں ہو؟ اگر تم جاپان کے محب وطن سپوت ہو تو پھر تم ایک — ایسے دستور کی حفاظت کیوں کر رہے ہو، جو ہماری اقدار کے منافی ہے — تم کیوں نہیں سمجھتے ہو کہ جب تک یہ دستور موجود ہے، تمہارا اپنا وجود صفر کے برابر ہے — آؤ ہم سب مل کر لڑیں اور جاپان کے وقار کے لیے لڑتے ہوئے مر جائیں — وطن انسانی زندگیوں سے بھی زیادہ اہم ہوتا ہے — آزادی یا جمہوریت — ہمارے لیے اہم نہیں۔ ہمارے لیے سب سے اہم چیز جاپان ہے —"

جب جاپانی سپاہیوں نے کوئی خاطر خواہ ردِ عمل ظاہر نہ کیا تو مشیما نے چیخ کر کہا :

"ہم اس دستور کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اپنی جانیں دے رہے ہیں — ٹینو ہیکو بنزائی (شاہنشاہ زندہ باد)"

یہ کہہ کر مشیما، جنرل کے کمرے میں داخل ہوا — اس نے پیٹ سے اپنی وردی پھاڑ دی — جنرل نے چیخ کر کہا :

"بے وقوف نہ بنو — رک جاؤ —"

مشیما نے بڑی عقیدت سے روایتی سمورائی کی طرح ہاراکاری کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا — اس نے اپنے پیٹ کے بائیں حصے میں روایت کے مطابق خنجر گھونپ دیا — اس کے پیچھے پچیس سال کا مورتیا کھڑا تھا مشیما کا ساتھی — اس نے روایت کے مطابق تلوار نکالی اور اپنے دوست، اپنے استاد، اپنے جنرل "مشیما کا سر تلوار کے ایک ہی وار سے اڑا دیا — ہاراکاری کی تقریب کو مکمل کرنے کے لیے اب مورتیا نے اپنے پیٹ میں خنجر گھونپا اور اس کے دوسرے ساتھی نے اس کا سر کاٹ دیا —

جاپان کے محب الوطن — جانباز، شمشیر زن، سمورائی کی تقریب مکمل ہو چکی تھی —

مشیما نے ایک کہانی "حب الوطنی" کے نام سے لکھی تھی اور پھر اسے ۱۹۶۵ء میں خود ہی فلمایا تھا — اس کہانی کے مرکزی کردار کو فلم میں اس نے خود ہی ادا کیا تھا — یہ ایک نوجوان لیفٹیننٹ کی کہانی تھی جو دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں کی شکست کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کر کے ہاراکاری کر لیتا ہے — مشیما نے ایک بار کہا تھا :

"یہ موت ہے جس کا خواب میں نے ہمیشہ دیکھا ہے —"

مشیما کا حقیقی خواب یہ تھا کہ وہ اپنے وطن کے لیے ایک جانباز کی طرح جان

وہ سکے — اس کا باپ ایک سمورائی تھا اور اُن کے خاندان کی شہرت کی بڑی وجہ یہی تھی کہ یہ سمورائیوں کا خاندان تھا -- اٹھارہ سال کی عمر میں ہی مشیما نے "جذباتی اور حب الوطن ہیرو" کی موت سے محبت کرنا سیکھ لیا تھا - مشیما جوانی میں کمزور جسم کا مالک تھا - اس نے کسرت اور ورزش پر توجہ دی اور جلد ہی ایک خوب صورت اور توانا جسم کما لیا -

انیس سال کی عمر میں اُس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا - ٹوکیو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے وزارتِ مالیات میں نوکری کر لی - ۱۹۴۸ء میں اس نے نوکری چھوڑ دی اور ایک کتاب شائع کی جس کا نام "ایک نقاب کے اعترافات" ہے - اس کتاب کا موضوع امرد پرستی تھا اور اپنی حقیقت پسندی کی وجہ سے یہ کتاب بہت مقبول ہوئی - اس کے بعد اس کا عظیم ناول TEMPLE OF THE GOLDEN PAVLION شائع ہوا - جس نے مشیما کو جاپان کے صفِ اول کے ناول نگاروں میں کھڑا کر دیا -

مشیما صاحبِ طرز ناول نگار تھا — اس کی نثر کلاسیکی جاپانی اسلوب اور جدید نثر کا خوب صورت امتزاج تھی — اُس کی نثر کی روح میں قدیم جاپانی روایات رچی ہوئی تھیں — اس نے سمورائی جذبات کو رومانیت کے درجے تک پہنچا دیا تھا - جدید علوم سے واقف ہونے کی وجہ سے اس نے نفسیاتی حقیقت پسندی سے بھی کام لیا اور اُسے فن کارانہ انداز میں برتا تھا — مشیما کی شہرت ساری دنیا میں تھی اور مغربی ممالک میں اُس کی تقریباً تمام اہم تصانیف کے تراجم ہو چکے ہیں -

وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا - اس کا گھر نوادرات سے سجا ہوا تھا - رات کو وہ تحریر و تصنیف کا کام کرتا — صبح کو لمبی تھکا دینے والی ورزش — وہ کہا کرتا تھا "میں اپنے جسم کو جاپانی اور یونانی حُسن اور توانائی کا مظہر بنانا چاہتا ہوں تاکہ ویسی ہی موت مر سکوں، جیسی میں چاہتا ہوں"

ممکن ہے مشیما کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو اُسے ایک 'رومانی' قرار دیا جائے؛ تاہم اس کی تخلیقی عظمت اور حب الوطنی سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ اس نے اپنی خود نوشت "سورج اور فولاد" کے نام سے لکھی تھی — صدیوں سے سورج کو جاپانی اپنا معبود اور مہربان آقا سمجھتے چلے آرہے تھے۔ 'فولاد' توانائی اور شکتی کی علامت ہے۔ اس فلسفیانہ خود نوشت میں مشیما نے اپنی موت کے بارے میں لکھا تھا:

"خون بہنے لگا — وجود کا تانا بانا بکھرنے لگا — حواس نے ایک نئی تاب اور لذت محسوس کی ہے — وہ منطقی خلا پُر ہوگیا ہے' جسے بصارت اور وجود نے مل کر پیدا کیا تھا اور یہی موت ہے — اس لذت کو میرے وجود اور میرے حواس نے کئی بار محسوس کیا ہے —"

موت کے ساتھ مشیما کی محبت بہت پرانی ہے — پچھلے سال اس نے ایک پبلشر کے کہنے پر ایسی کئی تصویریں کھنچوائی تھیں' جو ایک مرتے ہوئے آدمی کے مختلف تاثرات اور احساسات کو پیش کرتی تھیں — ان تصویروں کے پوسٹر بنائے گئے۔ ان میں ہاراکاری کرتے ہوئے سمورائی کا پوز بھی تھا اور جب مشیما نے ہاراکاری کی تو وہ سمورائی روایت پر پورا اُترا تھا —

جاپانی میں شاعری کی ایک صنف "واکا" کہلاتی ہے۔ اس نے ایک "واکا" اپنی موت کے دن لکھا تھا — پرانے سمورائیوں میں یہ بھی خوبی تھی کہ وہ ہاراکاری سے پہلے "واکا" یا کوئی نثری تحریر ضرور لکھتے تھے —

"تلواریں چمکنے لگی ہیں
صبر و تحمل اور برداشت کے زمانے
گزر گئے —
بہادر باہر نکل آئے

۔ دل کے جذبوں پر جمی ہوئی برف

پر حملہ آور ہو گئے ہیں ۔۔۔۔۔

سموراؤئی روایت اور اُس کا تخلیقی اور عملی اظہار — یہ وہ کنجی ہے جس سے مشیما کی زندگی اور تخلیقات کے تمام دروازے کھلتے ہیں۔ عالمی ادب نے کئی ہیرو پیدا کیے ہیں جو اپنے نظریات اور معتقدات کے ہاتھوں مر گئے یا مارے گئے "یوکیو مشیما عالمی ادب کا نیا ہیرو ہے"۔

سراج نظامی

بعض لوگ شہروں کی طرح ہوتے ہیں۔ جب تک شہر باقی رہتا ہے، شہر کے کھنڈر باقی رہتے ہیں، شہر کی یادیں باقی رہتی ہیں تب تک یہ لوگ بھی زندہ رہتے ہیں۔
سراج نظامی، اللہ کو پیارے ہوئے تو مجھے ایک شہر یاد آگیا۔
شہر لاہور۔ شہروں میں شہر لاہور۔ زندہ دلوں کا شہر، جیالوں کا شہر۔ تہذیب و ثقافت کا مرکز لاہور — اور وہ لاہور جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جس نے شہر لاہور نہیں دیکھا وہ تو پیدا ہی نہیں ہوا۔

سراج نظامی — سراج الدین احمد نظامی، دنیا سے اُٹھ گئے۔ لاہور سے رختِ سفر باندھ راہیٔ ملکِ عدم ہوئے، لیکن لاہور ہی کی مٹی میں دفن ہو گئے۔ ان کی موت سے اور تو جو نقصان ہوا سو ہوا، لیکن لاہور، پاکستان اور ساری دنیا کو ایک ایسا نقصان پہنچا ہے جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا، جسے کوئی بھی پورا نہیں کر سکتا اور وہ یہ کہ لاہور کا داستاں طراز دنیا میں نہیں رہا۔ وہ لاہوری کیڑا تھے — لاہور کی ایک ایک اینٹ کی کہانی انہیں ازبر تھی — لاہور شہر ان کے سانسوں میں رچا ہوا تھا — وہ خود مجسم لاہور تھے، لاہور کی ثقافت اور تہذیب کا نمونہ —

لاہور کی رنگارنگ زندگی اور تمدن کو ایسا کوئی شخص میسر نہیں آیا جو لاہور کی روح اور سماجی ثقافتی زندگی کو لفظوں میں بند کر سکے —

سراج نظامی نے یہ بیڑا اٹھایا تھا اور سچ یہ ہے کہ وہی اس کام کے سب سے زیادہ اہل تھے ۔ لیکن حالات اور زندگی نے انہیں مہلت نہ دی کہ وہ اس کام کو مکمل کر سکیں۔

بعض کام ادھورے رہ جانے کے باوجود بھی بھرپور ہوتے ہیں۔ لاہور کے حوالے سے سراج نظامی نے جو مضامین لکھے اور جو اب مختلف پرچوں میں دفن ہیں، اگر وہی یکجا ہو کر کتابی صورت میں آ جائیں تو بھی لاہور کے متنوع کلچر کی جیتی جاگتی کچھ تصویریں تو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو سکتی ہیں۔

اب یاد نہیں ہے کہ ان سے کب پہلی ملاقات ہوئی تھی، کہاں ملاقات ہوئی تھی، لیکن یہ یاد ہے کہ ان سے ملنے سے پہلے ۔ ان کے کچھ تراجم نظر سے گزر چکے تھے ۔ "پتھر کا دل" اور "کارمن" ۔ خاص طور پر "کارمن" کا ترجمہ تو مجھے بے حد پسند آیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں سراج نظامی نے مجھ پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان سے گفتگو کے بعد احساس ہوا کہ وہ بے ریا انسان ہیں ۔ زندہ دل اور مزیدار گفتگو کرنے والے۔ انہوں نے بڑا اچھا زمانہ دیکھا تھا ۔ وہ تاثیر، فیض، صوفی تبسم اور غلام عباس کے ساتھیوں میں سے تھے ۔ صوفی صاحب اور غلام عباس سے ان کے تعلقات بے تکلفانہ تھے ۔ تاثیر صاحب ہر شخص سے احترام کرایا کرتے تھے اور سراج نظامی بھی ان کا احترام کرتے تھے، حالانکہ تاثیر صاحب کے انتقال کو عرصہ گزر چکا تھا لیکن جب ڈاکٹر تاثیر کا ذکر آتا، سراج نظامی کے لہجے میں عقیدت اور احترام کا رنگ نمایاں ہو جاتا۔

سراج نظامی ان محفلوں اور ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھے جن کے تصور سے ہی خیال شاد و آباد ہو جاتا ہے۔

سراج نظامی کو خدا نے بڑا سریلا گلا بخشا تھا اور ان کی آواز کے جادو [illegible] ہر

علامہ اقبال بھی تھے ۔ علامہ اقبال اکثر اس نوجوان سراج نظامی کو یاد کیا کرتے تھے۔ جو ان کو علامہ اقبال ہی کی غزلیں گا کر سنایا کرتے تھے۔

ان صحبتوں اور محفلوں کی یادیں سراج نظامی کی زندگی کا سرمایہ تھیں۔ وہ بے تکلف انسان تھے ۔ بے تکلف گفتگو کرتے اور مزے مزے کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ایک عمر ان کی الیکشن کمیشن میں ملازمت کرتے گزری تھی مگر لکھنے پڑھنے کا چسکا نہ چھوٹا تھا ۔ اور پھر آخری عمر میں وہ "سیارہ ڈائجسٹ" اور "حکایت" کے عملہ ادارت میں شریک رہے تھے ۔

آج جب وہ انسان نہیں رہا ہے تو اس کی بہت سی باتیں یاد آنے کے ساتھ ساتھ یہ بات سب سے زیادہ یاد رہی ہے کہ وہ دوستوں کے لیے ہر طرح کا ایثار کر سکتا تھا اور دوستوں نے ہی اس کے اعتماد کے آئینے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ بہت دکھی تھے۔ دوستوں کی بے وفائیوں کے جگر کے گہرے ناسور بن چکے تھے ۔ حرفِ شکایت تو ان کے لب پر کبھی نہ آیا ۔ لیکن دل ٹوٹ چکا تھا۔

وہ بستر علالت پر دراز تھے ۔ ان کی قوتِ گویائی چھن چکی تھی۔ مگر آنکھیں ۔ ساری داستان کہہ دیتی تھیں۔

ان کے بھائی فیروز نظامی اپنے فنِ موسیقی میں استاد تھے۔ وہ ایک بار ملے تو انہوں نے بتایا :

"بھائی جان (سراج نظامی) کی زبان بند ہو گئی ہے ۔"

سراج نظامی جیسے شریف آدمیوں کی زبان بندی تو ہمارے ہاں کا دستور بن چکی ہے ۔ اور "ژان بہشتار ہا" کا بیشتر ترجمہ سراج نظامی نے کیا تھا ۔ پہلے ایڈیشن پر محمود رجا جالندھری کے ساتھ ان کا نام بھی شائع ہوا ، لیکن دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو

سراج نظامی کی زبان بند رہی —

جب انہیں آخری بار ملازمت سے جواب دیا گیا تھا تو بھی ان کی زبان بند رہی۔
وہ جامع الصفات انسان تھے — طب، شاعری، نثر سب میں مہارت تامہ رکھتے
تھے۔ لیکن ان کی باتوں کی شوخیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی آنکھوں میں ایک ایسی شرافت
تھی کہ جو ان کی ساری خوبیاں چھپائے رکھتی تھی

اور آج جب وہ زندہ نہیں ہیں تو لاہور کی اینٹ اینٹ، گلی گلی، محلے محلے نے
اس کو یاد رکھا ہے

جیسا ہے تو انسانوں نے۔ لاہور شہر سراج نظامی کو نہیں بھول سکتا — وہ
لاہور شہر کا آخری داستان گو تھا۔

ذکی بی اے

تنویر نقوی جتنے کم گو تھے، ذکی بی اے اتنا ہی باتونی انسان تھا۔ جب کم گو تنویر نقوی کا انتقال ہوا تو ذکی بی اے زار و قطار رو رہا تھا اور اب ذکی بی اے بھی ہم سے بچھڑ گیا ہے۔۔ وہ لاہور سے دُور۔۔ اللہ کو پیارا ہوا۔۔ میں نہیں جانتا کہ جب اس کا جنازہ اُٹھا ہوگا تو اس کے ساتھ کون کون تھا۔

تنویر نقوی کے ہاں آٹھ دس برس پہلے ذکی بی اے سے میری پہلی ملاقات ہوئی اس کے چوڑے چکلے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔۔ پہلی ملاقات میں ہی اس کے متعلق میں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ اس شخص نے کتے (پنجابی میں بات زیادہ مزیدار بنتی ہے کہ کاں)، کھا رکھے ہیں۔ ہر وقت اس کی زبان چلتی رہتی ہے۔ اس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ وہی زیادہ بولتا رہا اور اپنے سامنے کسی کو کم ہی بولنے دیتا تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔

جب بھی ملاقات ہوتی، وہ بڑے تپاک سے ملتا۔ گھیر گھیر کر چائے پلاتا۔ اُٹھنے کا نام نہ لینے دیتا۔۔ ایک دن کسی مسئلے پر میری اُس کی بحث کچھ ناخوشگوار سی صورت اختیار کر گئی۔۔ مجھے شکایت یہ تھی کہ میری بات وہ سُن ہی نہ رہا تھا اور حسب معمول اپنی ہانکے جا رہا تھا۔۔ میں نے کوئی سخت بات کہہ دی تو اس نے بُرا تو نہ منایا مگر زبان بھی نہ روکی اور اپنی بات پر مصر رہا۔۔ میں جب اُٹھا تو میں نے فیصلہ کیا کہ ایسے

دوست کیا مل کر کبھی کسی کی سنتا ہی نہیں، اپنی ہی سنائے چلا جاتا ہے۔ پھر بحث بھی کچھ ایسی تھی کہ جس میں میں اپنے آپ کو حق پر سمجھتا تھا۔ کئی مہینے میں نے اس سے ملاقات نہ کی۔ ہم ایک دوسرے سے دور ہو گئے۔ لیکن ایک دن اس کا پیغام آیا کہ میں اس سے ملوں۔ میں نہ گیا۔ پھر کچھ مشترکہ دوستوں کے حوالے سے اس کی شکایت مجھ تک پہنچی کہ میں اس سے کترا رہا ہوں۔ جب کئی مہینوں کے وقفے کے بعد میری اس کی ملاقات ہوئی تو وہ یوں ملا جیسے ہمارے درمیان کوئی اختلاف ہی پیدا نہ ہوا تھا جیسے ہم ابھی کل ہی ملے تھے۔ ہی قہقہے، وہی باتیں اور وہی گھنٹوں پھیلی ہوئی گفتگو شروع ہو گئی۔

جب اس نے ہدایت کاری شروع کی اور فلم شوٹ کرنے لگا تو میری اس کی ملاقاتوں کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی پھیل گیا۔ جب بھی شوٹنگ ہوتی، وہ مجھے ضرور بلاتا۔ خود آ کر دعوت دیتا۔ وہ سین سناتا جو وہ فلمانے والا ہوتا تھا۔ "خون بولتا ہے" کا سارا سکرپٹ میں نے مختلف اوقات میں اس سے زبانی سن لیا تھا اور جب میں سیٹ پر پہنچتا تو وہ سو کام چھوڑ کر نعرہ لگا کر میرا نام پکارتا، سینے سے لگاتا اور پھر باتوں میں لگ جاتا۔ بعض اوقات تو وہ شوٹنگ کرنا بھی بھول جاتا۔ مجھے ندامت سی محسوس ہونے لگتی کہ میں اتنے تپاک کا مستحق تو نہیں ہوں کہ وہ شوٹنگ چھوڑ کر میری آؤ بھگت میں لگا ہوا ہے۔

آج جب وہ زندہ نہیں ہے تو میں سوچتا ہوں کہ وہ کتنا اچھا اور جذباتی دوست تھا۔ وہ دوستوں کا استقبال کرنا جانتا تھا۔ وہ دوستوں کے لیے اپنی اہم ترین مصروفیات کو نظر انداز کر دیتا تھا۔ اس کے برعکس وہ ہدایت کار جو سیٹ کے باہر مجھ سے گھنٹوں باتوں میں مصروف رہتے تھے، سیٹ پر ان کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ آنکھیں چرا لیتے تھے۔ اگر دیکھ بھی لیا تو پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا اور کام میں لگ گئے۔ میں نے ان کے اس طرزِ عمل کا کبھی برا نہ منایا تھا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ سیٹ پر ہدایت کار کی مصروفیت اور ذہنی حالت کیا ہوتی ہے۔ لیکن ذکی بی اے ان سب سے

مختلف تھا۔ وہ دوستوں کے لیے ــــ سب کچھ بھول جاتا تھا۔

میں نے اسے مختلف انداز میں دیکھا ہے ــــ لڑتے بھی، جھگڑتے بھی، ہنستے بھی، روتے بھی اور محبت کرتے بھی۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کی زبان کبھی نہ رکتی تھی۔ جس کے بازو دوستوں کے لیے پھیلے رہتے تھے۔ جس کے دل میں دوستوں کے لیے ہمیشہ محبت کا چشمہ بہتا رہتا تھا۔ وہ لڑائی بھی مول لیتا تو پھر خود ہی صلح پر آمادہ ہو جاتا تھا ــــ ایک زمانے میں اس کے ساتھ بہت سے لوگوں کو پیشہ وارانہ شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں لیکن میں نے دیکھا کہ وہ ہنس کر ٹال دیتا تھا اور پھر دوسری باتوں میں مگن ہو جاتا۔

ذکی بی اے ایک اچھا انسان تھا ــــ وہ فلمی دنیا میں اچھے عزائم لے کر آیا تھا۔ اس کے کریڈٹ پر کچھ اچھی پنجابی فلمیں بھی ہیں ــــ وہ اردو میں ایک بڑی فلم بنانے کے خواب دیکھتا تھا۔ افسوس، اس کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا ــــ آج جب وہ زندہ نہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بعض لوگ کتنے ہی خواب اور ارمان اپنے سینوں میں لیے مر جاتے ہیں۔ ذکی بی اے بھی ایسا ہی ایک انسان تھا۔

ایک دوست کی حیثیت سے وہ جب بھی یاد آئے گا، مجھے اس کی باتیں، اس کا باتونی پن اور جذباتی خلوص ضرور یاد آئے گا۔

زندگی کے آخری سفر کی داستان

ریاض شاہد

سانس کی دھونکنی تیزی سے چل رہی تھی — اس بے ثبات دنیا اور زندگی میں بعض زندہ رہنے والی فلموں، کرداروں، مکالموں اور تحریروں کا خالق آس پاس سے بے خبر زندگی کے آخری سانس پورے کر رہا تھا — عابدہ بھابی (نیلو) کے چہرے پر ویرانی تھی — اور ریاض شاہد کی بوڑھی والدہ اپنے بیٹے کا ہاتھ تھامے اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں — ریاض شاہد کے چل چلاؤ کا لمحہ آ گیا تھا — پھر ریاض شاہد کو کھانسی آئی۔ اس کے بعد بلغم اور خون سے بھرا ہوا جسم دہرا متہرا ہو گیا — عابدہ بھابی نے سہارا دے کر تھوڑا سا اٹھایا — ہماری بھیگی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ ریاض شاہد کا جسم ان کا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔۔

ڈاکٹر تو پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اب انہونی کے ہونے میں کوئی دیر نہیں رہ گئی۔

یونہی ایک دم ہمیں یاد آیا ۔۔۔۔ یو ہی ایچ کے باہر محمد علی کا کرتہ پسینے کی شدت سے ان کے جسم کے ساتھ چپک گیا تھا۔۔ ان کے چہرے پر حزن و ملال تھا اور وہ کہہ رہے تھے:

"ریاض کے پاس کھڑا ہونے کے لیے ہمت کہاں سے لاؤں — وہ تو ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔"

ابھی ابھی حبیب بھی ریاض شاہد کو دیکھ کر آئے تھے اور ان کی آنکھیں بھی بھیگی

ہوئی تھیں ۔ خواجہ انشاء کچھ لوگوں کو پچھلی رات کی تفصیل بتا رہے تھے ۔۔ وہ رات جب ریاض شاہد نے موت کو کئی بار گلے لگایا تھا ۔ سید عطاءاللہ شاہ ہاشمی ایک کار کے ساتھ کھڑے جانے کیا سوچ رہے تھے مگر عینک کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی آنکھیں ریاض شاہد کے غم میں بھیگی ہوئی تھیں ۔ ٹیکسیوں اور کاروں کی پارکنگ کے کچھ پرے ایک سٹیشن ویگن کھڑی تھی جس کے پاس ریاض شاہد کے بھائی بیٹھے تھے ۔ ان کے چہرے اُترے ہوئے تھے ۔ کئی راتوں سے مسلسل جاگنے اور رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور پھر ۔۔ ایک خوب صورت پیاری سی بچی تتلی کی طرح چک پھیریاں لیتی ہوئی ادھر ادھر دوڑنے لگی ۔ اُسے دیکھ کر ہر شخص کی آنکھیں بھر آئیں ۔۔ یہ ریاض شاہد کی بیٹی زرقا تھی ۔ موت کی سفاکی اور سنگدلی کے ساتھ ساتھ بچپن کی اس معصومیت کی ہم آہنگی نے ایک ایسی تصویر بنا دی تھی جو موت سے بھی بڑی اور زندگی سے بھی عظیم تھی ۔

رات کے سائے پھیلتے جا رہے تھے ۔ یڈسی ایچ میں ریاض شاہد بستر مرگ پر اپنی آخری سانسیں پوری کر رہے تھے ۔۔ یہ ان کی زندگی کی آخری رات تھی ۔ اس رات کے آخری پہر میں وہ اپنی زندہ رہنے والی تخلیقات کے دیرپا نقش چھوڑ کر دنیا سے اٹھ گئے ۔ کیا ان کا کام ختم ہو چکا تھا؟ نہیں ' ابھی تو انہوں نے بہت کچھ کرنا تھا ۔ بہت کچھ لکھنا اور بہت سی فلمیں بنانا تھیں اس استحصالی نظام کو بدلنے کے لیے ایک شہری اور تخلیق کار کی حیثیت سے جدوجہد کو تیز تر کرنا تھا ۔ ابھی کارِ جہاں دراز تھا کہ انہیں بلا لیا گیا ۔

زندگی کا ایک سفر ختم ہوا اور دوسرے کا آغاز ہوا ۔ ریاض شاہد کا آخری سفر ۔

گلبرگ میں ریاض شاہد کی کوٹھی ویران تھی ۔ دھوپ میں موت کی زردی تھی ۔ مکین دنیا سے اُٹھ چکا تھا ۔۔ ریاض شاہد کے جسدِ خاکی کو دھنی روڈ پہنچا دیا گیا تھا ۔ ان گلیوں

اور بازاروں میں جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے کئی معرکے سر کیے تھے: انتخابات لڑے تھے، اپنے ناول "ہزارداستان" کے کردار دیکھے تھے اور ان کو اپنا خون دے کر لفظوں کی صورت میں زندہ کیا تھا' ان گلیوں اور بازاروں میں ریاض شاہد نے اپنی فلم "سسرال" کی فلم بندی کر کے: زندگی کی سچی عکاسی کی تھی ـــ یہاں ان کے بڑے بھائی تھے، ان کی بہنیں تھیں' ان کے بڑھے والد تھے اور بوڑھی والدہ بھی ـــ اور فلمی صنعت کا ہر فرد ان کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے پہنچا ہوا تھا۔

ریاض شاہد کا پہلا اور آخری ناول "ہزار داستان" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ناول کے آغاز میں ریاض شاہد نے لکھا تھا:

"میں نے اپنے قلم سے معاشرے کے آنسوؤں کو وقت کے دھاگے میں پرو کر زندگی کی لڑیوں کی صورت دینا چاہی ہے اور ان لڑیوں میں مشاہدے کی کلیاں اور مسکراہٹوں کے شگوفے بھی گوندھ لینے کی کوشش کی ہے۔

صحیح خوشی مجھے اس وقت ہوگی جب "ہزارداستان" پڑھنے کے بعد کسی قاری کے دل میں معاشرے کی ناہمواریوں کا شدید احساس انگڑائیاں لینے لگے گا: بہرحال اگر کوئی اہل دل میرے اور اپنے درد کو مشترک پا کر کسمسا جائے یا کوئی اپنی ڈاڑھی میں تنکا سمجھ کر ملا اٹھے تو میں سمجھوں گا کہ میرا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔"

ریاض شاہد نے اپنے ناول "ہزار داستان" کے حوالے سے جو تیر چلایا تھا' وہ نشانے پر بیٹھا تھا ـــ پڑھنے والے درد مشترک کی وجہ سے کسمسائے بھی تھے اور جن کی ڈاڑھیوں میں تنکے تھے وہ تلملا بھی اٹھے تھے ـــ حیران کرنا ـــ اور سب پر چھا جانا، ریاض شاہد کی شخصیت کا بنیادی وصف تھا ـــ فلوبیئر نے کہیں لکھا تھا کہ "لکھنے والے کا اصل مقصد چونکانا ہوتا ہے"۔ ریاض شاہد نے زندگی کے ہر روپ اور ہر عہد میں چونکانے کا فریضہ ادا کیا ـــ ریاض شاہد کے اس ناول کا ابتدائیہ جناب احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا۔

"ریاض شاہد کی یہ کامیابی اس لیے حیران کن ہے کہ یہ اس کا پہلا ناول ہے۔
ایک بڑے فن کار کے تمام آثار اس کے پہلے ناول "ہزار داستان" میں موجود ہیں۔"
الوکھے انداز میں بات کہنا اور زندگی کے ہر عمل کو چونکانے کی حد تک لے جانا،
ریاض شاہد کا شیوہ تھا — اب بھی وہ موت کے ساتھ اتنی دیر تک لڑتے رہے تھے
کہ کئی لوگ چونک اٹھے تھے — ان کو جو بیماری لاحق تھی، اس کا علاج ہی اب تک
دنیا دریافت نہیں کر سکی — اس "لاعلاجی" کے باوجود موت کے ساتھ تڑتا رہا۔ ریاض شاہد
نے مزاحمت کی ایک چونکا دینے والی مثال قائم کی — وہ لوگ جو انہیں ان کی زندگی
کے آخری دنوں میں ملے، وہ جانتے ہیں کہ جب تک زبان نے ساتھ دیا، ریاض شاہد
نے شگفتگی اور فقرے بازی کو ترک نہ کیا۔ ان کا جسم گھل رہا تھا۔ موت نقب لگا چکی تھی
لیکن وہ ہنستے رہے — مجھے یاد ہے جب پہلی بار بیماری نے ان پر حملہ کیا اور وہ میو
ہسپتال میں داخل تھے تو ہم خون کے سرطان کی بیماری کا نام سن کر لرزتے اور
کانپتے ہوئے، اُن کی عیادت کے لیے گئے تھے — رشید جاوید اور علی سفیان آفاقی
کے چہروں پر زردی تھی اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں — ان کی سب سے بڑی خواہش
یہ تھی کہ ریاض شاہد ان کے چہروں سے کچھ بھانپ نہ لے — جب ہم ان کے کمرے
میں پہنچے تو ریاض شاہد غائب تھے — پتا چلا کہ بھائی کے گھر گئے ہیں۔ وہاں سے
ابھی آنے والے ہیں — کچھ دیر انتظار کیا، پھر خبر ملی کہ وہ ایس راہی پینٹر کے ڈیرے
پر بیٹھے ہیں — ہم وہاں پہنچے تو جان لیوا مرض میں گرفتار، ریاض شاہد حسب معمول "مجمع"
لگائے خوش گپیوں میں مصروف تھے —

ریاض شاہد نے اپنی فلموں، اپنی تحریروں، اپنی عادتوں اور باتوں سے ادب، فلم
اور معاشرے کو بار بار چونکایا —

انہوں نے ناسازگار حالات بھی دیکھے لیکن کبھی ہمت نہ ہاری — کالج کے

دنوں میں انہوں نے ڈیبیٹر کی حیثیت سے چونکایا۔ تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سیاست کے ساتھ عملی اور نظریاتی تعلق مرتے دم تک قائم رکھا۔

۱۹۵۵ء میں وہ ہفت روزہ "چٹان" میں آئے۔ "چٹان" کا یہی دفتر، جس کے اوپر "ممتاز" میں بیٹھا ہوا میں ریاض شاہد کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ اس کے بیباک جملوں اور قہقہوں سے گونجتا رہا ہے۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے چٹان میں ریاض شاہد کا ایک چونکا دینے والا افسانہ "موت پہلوان" شائع ہوا جس میں ایک کردار کی زندگی کے حوالے سے معاشرے کی ناہمواریوں اور مخصوص تہذیب کے بعض ڈھکے چھپے پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا تھا۔ طنز ان کی تحریر میں ہمیشہ سے تھا۔ چٹان کے ہی ایک شمارے (۷ نومبر ۱۹۵۵ء) میں ان کا ایک مضمون "پرچہ ریاضی الف برائے جماعت دہم" شائع ہوا جس میں ایک پانچ نمبر کا سوال یہ تھا:

کون سا بڑا ہے؟

$$\frac{\text{مجبوری}}{\text{جرم}} \quad \text{یا} \quad \frac{\text{بھوک}}{\text{موت}}$$

پھر ڈھائی نمبر کا ایک سوال ہے:

"وہ کون سا مبارک دن ہوگا جب ہمارے عوام معاشی مسائل سے چھٹکارا پائیں گے؟"

"چٹان" کے ہی ایک اور پرچے میں ریاض شاہد نے جماعت دہم کے لیے پرچہ تاریخ جغرافیہ (۵ دسمبر ۱۹۵۵ء) مرتب کیا تھا جس کے دو سوال یہ تھے:

کلرک کی پہلی تاریخ، مجرم کے فیصلے کی تاریخ اور بڑے آدمی کی موت کے قطعہ تاریخ میں کیا فرق ہے؟

پاکستان کا حدود اربعہ کسی سمگلر سے دریافت کرکے بالتفصیل لکھو!

'چٹان' میں ریاض شاہد کے چونکا دینے والے افسانے، طنزیے، فیچر اور انٹرویو چھپتے رہے اور جن کی ڈاڑھیوں میں تنکے تھے وہ تلملاتے رہے۔ "سخی کی خیر" کے عنوان سے سرورق فیچر پر خوب گرماگرمی ہوئی تھی — کارپوریشن والوں نے بڑا احتجاج کیا تھا — مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کی وفات پر ریاض شاہد نے ایک ایکٹ ڈراما لکھا تھا جس میں لکھنے والے کی غربت اور پسماندگان کی حالت کا نقشہ بڑی سفاکی سے کھینچا تھا — اس ایک ایکٹ کے کھیل کا نام ریاض شاہد نے 'پانچواں درویش' رکھا تھا اور اس کے کردار تھے — باری علیگ، ڈاکٹر تاثیر، اختر شیرانی، منٹو اور چراغ حسن حسرت — اس کھیل میں منٹو مرحوم کی زبان سے ریاض شاہد نے ایک جملہ کہلوایا تھا۔

"موت تو خود زندگی کو ننگا کر دینے کا نام ہے۔"

اب جو ریاض شاہد دنیا سے اٹھ گئے ہیں اور انہوں نے موت کو گلے لگا لیا ہے تو وہ ایک طرح سے موت کی سچی تصویر پیش کر گئے ہیں — اپنی تحریروں اور فلموں میں وہ زندگی کی عکاسی کرتے رہے۔

"چٹان" کے بعد وہ "لیل و نہار" میں چلے آئے — یہاں بھی ان کے قلم سے کئی چونکا دینے والی تحریریں نکلیں — اس کے بعد انہوں نے فلم کا رُخ کیا۔ تب تک ریاض شاہد کے سیاسی عقائد اور نظریے پختہ ہو چکے تھے — ان کا اسلوب بھی بن چکا تھا — 'چٹان' میں شورش کاشمیری اور پھر ان کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر ان پر راسخ ہو چکا تھا۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے انداز میں اپنی انفرادیت پیدا کی اور یوں اردو فلموں میں مکالموں کا انداز بدلا۔

ریاض شاہد کی علالت سے بہت پہلے "یہ امن" کے سنسر سرٹیفکیٹ کا جھگڑا

چلا تھا — یحییٰ خان کی حکومت کسی قیمت پر "یہ امن" کو نمائش کا اجازت نامہ دینے کے لیے تیار نہ ہو رہی تھی — ان دنوں ریاض شاہد پر مصیبتوں اور پریشانیوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا — وہ انسان جو اپنی بذلہ سنجی، تیز تیز گفتگو اور بے باکی و جرأت مندی کی وجہ سے مشہور تھا — اندر ہی اندر سلگنے لگا تھا — محمد علی اس زمانے میں ہی ریاض شاہد کا سایہ بن گئے تھے — وہ ان کے ساتھ اسلام آباد جاتے رہے "یہ امن" کے اجازت نامے کے حصول کے لیے جو کچھ ریاض شاہد پر بیتی، وہ اس المناک روداد کے شاہد تھے — اسی زمانے میں ریاض شاہد پر مرض نے حملہ کیا۔

اس زمانے میں مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ریاض شاہد میں کوئی بڑی تبدیلی آ چکی ہے — وہ جس کی زبان باتیں کرتے نہ رکتی تھی، اب اسے گہری چپ لگ گئی تھی۔ انہی دنوں میں میں نے ایک اور تبدیلی بھی دیکھی کہ وہ ریاض شاہد جو ایک ہی وقت میں دس دس آدمیوں کو لاجواب کر دیا کرتا تھا جو دوسروں پر چھا جایا کرتا تھا، وہ معمولی معمولی کلرکوں سے بھی بڑی لجاجت سے باتیں کرتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے "یہ امن" کے سلسلے کے متعلقہ کام کر دیے جائیں — ایک عجیب اضطراب اور بے چینی تھی جو اس کے وجود میں سما گئے تھے۔ تب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اپنے آپ کو کوئی موذی روگ لگا بیٹھا ہے —

اس نے جو مرض اپنی جان کو لگایا تھا — وہ لاعلاج تھا — خون کے سرطان کا تو دنیا بھر میں ابھی تک علاج بھی دریافت نہیں کیا جا سکا — ریاض شاہد کو موت اپنی طرف کھینچ رہی تھی، مگر وہ زندگی کے لیے جنگ لڑ رہا تھا — اس نے جس پامردی اور ہمت سے موت کے خلاف جنگ لڑی، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ بیماری کے پہلے دور کے بعد جو درمیانی وقفہ اسے ملا۔ اس میں ریاض شاہد نے کئی کام کیے۔ ہاکو کا سکرپٹ مکمل کر لیا — اس کے دو گانے بھی ریکارڈ کرائے — مگر یہ وقفہ بہت

مختصر تھا — جان لیوا مرض اندر ہی اندر اپنا کام کر رہا تھا اور پھر جو ریاض شاہد بستر علالت پر لیٹا تو نہ اٹھ سکا —

بیماری کے انہی دنوں میں ایک دن اس نے اداکار محمد علی سے کہا :

" میں اسے گھر لے چلوں — وہ اپنے بچوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ تب تک اس کی حالت خاصی خراب ہو چکی تھی — میں اس کی اس خواہش کو رد نہ کر سکا — اُسے کار میں سوار کرایا اور اس کے گھر کی طرف چل دیا — راستے میں ریاض شاہد کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی — میں نے اسے سنبھالا دیا۔ اس سے پوچھا :

" ریاض، تمہارے دل پر کوئی بوجھ ہے تو مجھے بتا دو — کوئی پریشانی ہے تو کہو — "

ریاض شاہد نے بڑی بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں کہا تھا :

" یار، کیا کروں — بچوں کا خیال ستاتا رہتا ہے — "

اسے مرتے دم تک اپنی بیوی اور بچوں کے مستقبل کا دھیان رہا۔ یہ احساس اس پر اس طرح سے چھا چکا تھا کہ دل سے نہ نکلتا تھا — اس کی بیماری بڑھتی گئی۔ موت کا دن قریب آتا گیا —

ریاض شاہد کی تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ بے ہوشی اور تکلیف کم کرنے کے لیے مارفیا یا پیتھیڈین کے انجکشن بھی کام نہ کرتے تھے — خون کی گردش رُک چکی تھی — کوئی چیز اثر نہ کرتی تھی

آخری دنوں میں تو اس کی زبان بند ہو چکی تھی — یوں جس نے صحیح معنوں میں پاکستانی فلموں کو زبان بخشی تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا —

ریاض شاہد نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اپنا نوحہ خود ہی لکھا تھا۔۔
اپنی بیماری سے کچھ دن پہلے انہوں نے "بلاکو" کا سکرپٹ مکمل کیا۔ اس کے لیے دو گیت بھی لکھے — ایک گیت مکمل اور دوسرا نامکمل رہا — ریاض شاہد مرحوم بہت اچھے شاعر بھی تھے مگر ان کا آخری مکمل گیت — موت کے اس کشف کا اظہار ہے جو ریاض شاہد پر ہو چکا تھا — یہ گیت نورجہاں اور منیر حسین کی آوازوں میں ریکارڈ ہو چکا ہے — اسے سن کر آنکھوں کے سامنے ریاض شاہد کی موت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے — یہ ریاض شاہد کا اپنا ہی نوحہ ہے — اس گیت کی دھن اے حمید نے بنائی ہے ... ریاض شاہد مرحوم نے اے حمید سے کہا تھا:

"اس گیت میں مجھے بین سنائی دیتے ہیں — بین کی آوازیں — جیسے ایک شہر مر گیا ہو —"

پھر انہوں نے مختصر سے توقف کے بعد کہا تھا:

"جیسے میں مر گیا ہوں اور چاروں طرف بینوں کی آواز گونج رہی ہے —"

ریاض شاہد کی بڑی بہن نے جب اس گیت کے بول سنے تو اپنے بھائی کا منہ چوم کر پوچھا تھا:

"تم ایسے گیت کیوں لکھ رہے ہو؟"

وہ بے چاری کیا جانتی تھی کہ ریاض شاید دنوں کا مہمان ہے اور یہ گیت اس کا اپنا ہی نوحہ ہے۔ اس نوٹ کے ساتھ ہم نامکمل گیت بھی شائع کر رہے ہیں۔

دل کا شہر اُداس ہے یارو
رات آئی ہے غم کی
خاموشی میں یہ آوازیں
اپنے ہی ماتم کی

اے تاریک ندی اے چاندنی
اِس شب کے پیچھے پڑے ہے
دُور دُور اِس لشکر سے
اے چاند جا چاندنی

دیواروں پہ غم کے سائے
روتے ہیں بازو پھیلائے
ایسا وقت خدا نہ لائے
دل کے ہاتھوں دل مر جائے
——— دل مر جائے
چار طرف ہُو کا عالم ہے
پہلو پہلو غم ہی غم ہے
سانس رُکی ہے لب پہ دم ہے
جینے کی امید بھی کم ہے

(۲)

رقص بسمل دیکھ اور بہتے لہو کا جام دیکھ
اے میرے قاتل میرے بے جان بازو تھام لے
زندگی ہے آخری دم پہ تمہارے سامنے
جا میرے قاتل اب تو خدا کا نام لے

(نامکمل)

تنویر نقوی کے نام آخری خط

شاہ جی،
زندگی میں آپ کے نام میں نے کئی چھوٹے چھوٹے رقعے لکھے تھے۔ ان کا جواب بھی آپ مختصر سا دیا کرتے تھے۔ یہ میرا آپ کے نام قدرے طویل خط ہے، اور شاید یہ میرا آخری خط ہے جو میں آپ کے نام لکھ رہا ہوں۔ آپ کو اب میرے طویل اور مختصر خط پڑھنے کا وقت نہیں ملے گا اور مجھے آپ کے جواب کا انتظار بھی نہ ہوگا، کیونکہ آپ اب جہاں چلے گئے ہیں، وہاں سے کوئی خط نہیں آتا۔ یہ خط بھی اگر آپ کو نہیں ملتا تو میرا کچھ قصور نہیں، قضا و قدر کے کارکنوں کا جبر سمجھیے گا۔ آپ سے میں معذرت بھی نہیں کروں گا کہ یہ خط آپ کو نہیں مل سکا۔ کسی پر خفا ہوئے ہوں تو پھر آپ کا کوئی ڈر بھی ہو اور اب تو آپ ایسی حالت میں ہیں کسی پر کیا ناراض ہوں گے۔

شاہ جی،
ابھی چند دن ہوئے، الحمرا کی سٹیج پر آپ کی اعانت کے لیے کھیلے جانے والے ڈرامے "دیوار کے اس پار" کے خاتمے پر عزیز اثری کہہ رہے تھے:

"اگر تنویر نقوی مر گیا تو نغمہ مر جائے گا"

آج آپ "دیوار کے اس پار" چلے گئے۔ جہاں سے آپ کو کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ جہاں کوئی شخص جیتے جی جا نہیں سکتا۔ آپ مر گئے ہیں..... مگر آپ کے

نغمے زندہ رہیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خالق مرجاتا ہے' اس کی تخلیق زندہ رہتی ہے مگر بعض اوقات دل یوں چاہنے لگتا ہے کہ اچھی تخلیقات کا خالق بھی ہمیشہ زندہ رہے۔ آپ درویش صفت تھے۔ آپ کی یہی درویشی لے ڈوبی؛ ورنہ آپ اس طرح نہ مرتے ۔۔

شاہ جی'

اپنی مثال تو اس شخص کی ہے جو صرف نوحہ بن کر رہ گیا ہو۔ ٹھیک سے یاد نہیں آتا ۔۔ شاید مولانا چراغ حسن حسرت ہی تھے جنہوں نے ۔۔۔ ایک مشاعرے میں جب حفیظ جالندھری کلام سنا رہے تھے اور انہوں نے حسرت صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا:

"حسرت صاحب مصرعہ اٹھائیے"

اور حسرت صاحب نے جواب دیا:

"اب زندگی میں دو کام ہی تو رہ گئے ہیں مولانا ۔۔ مصرعہ اٹھانا اور یاروں کے جنازے اٹھانا ۔۔"

شاہ جی'

سوچتا ہوں کہ آپ جیسے وضعدار، خود دار اور شریف آدمی کو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا ۔ میں اپنے ساتھیوں، زندگی کی جدوجہد کو تیز کرنے والے رفیقوں میں بد دلی پھیلانا نہیں چاہتا۔ مگر اتنا ضرور پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمارے سارے اچھے خواب، ساری جدوجہد اور مخلصانہ تگ و تاز کا حاصل یہی ہے کہ ہم کسمپرسی اور نکبت کے عالم میں مریں ۔۔

کیا آپ نغموں کی تخلیق صرف اس لیے کرتے رہے کہ آپ کی موت زندگی اور جدوجہد کا نوحہ بن کر رہ جائے ۔۔

آپ نے تو یہ خواب دیکھا تھا کہ اونچ نیچ ختم ہو جائے گی۔ دلوں کی کدورتیں دھل جائیں گی — سرمائے کا استحصال ختم ہو جائے گا — بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی شیرینی میں بدل جائے گی — بھوک اور ناداری مٹ جائے گی — اور ــــ

وہ زمانہ ضرور آئے گا'

جس میں کسی کی دلآزاری جرم ہو گی — خوشیوں کے نغمے بکھریں گے — اس معاشرے کی تعمیر کے لیے آپ اپنی ذات کو تخلیق کے کرب میں ڈھالتے رہے اور ایک ایسے انسان بن کر سامنے آئے جو کسی کا دل نہ دکھاتا تھا جو زندگی کے مصائب کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو سکتا تھا — مگر یہ کیا ہوا ؟
وہ معاشرہ — جس کا خواب آپ نے دیکھا تھا' اب بھی ایک خواب ہے۔
آپ "بے وفا زمانے سے جواب" طلب کرتے رہے' مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا.....
بے بسی کی موت .....

شاہ جی'

اس معاشرے کے دیوتاؤں نے آپ کے نغموں کی بڑی بھاری قیمت وصول کی ہے — آپ کو وہ بیماریاں دیں جو موت کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہیں۔ آپ کو وہ دکھ دیے جن کا کوئی علاج نہیں — آپ کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھتا گیا' مگر ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونے کا راستہ دکھلانے والی تمام مشعلیں گل کر دی گئیں — پھر بھی آپ نے ہمت نہ ہاری —

آپ کو یاد ہو گا' جب آپ اپنے بیٹے شہباز کے ساتھ مجھے رائل پارک میں ملے تھے — آپ کو ایک گز کا فاصلہ طے کرنے کے لیے اپنے جسم کو گھسیٹنا پڑ رہا تھا — میں نے آپ سے کہا تھا : "آپ گھر میں آرام کرتے' آپ کی صحت اجازت نہیں دیتی کہ آپ یوں ....."

آپ نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا' وہ اب تک میرے دل میں چھید کر رہی ہیں — آپ ایک فلم ساز کے پاس نغمہ لے کر آئے تھے — ایک نیا گیت — جو گلی گلی گونجنے والا تھا —

شاہ جی'

آپ سے بہتر میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ وہ جس کے نغمے گلی گلی گونجتے ہیں — ہم اس کے ہاتھ میں کاسہ پکڑا کر اسے گلیوں' دفتروں اور بازاروں میں در بدر کر دیتے ہیں — آپ نے وہ نغمے لکھے جن میں زندگی کی ساری شیرینیاں اور تلخیاں تھیں آپ نے چہروں کو چاند بنا دیا — ہونٹوں میں انقلاب کی آگ بھر دی — ہمیں زندگی کے خوب صورت خواب دکھاتے رہے —

شاہ جی'

جب آپ جیسا آدمی — آپ جیسا نغمہ نگار — آپ جیسا شاعر' بے بسی اور بکبت کی موت مرتا ہے تو پھر میرے جیسے لوگوں کی روح پر یہ سوال کوڑوں کی طرح برسنے لگتا ہے —

آخر اس معاشرے میں شاعر' ادیب' فن کار اور تخلیق کے پھول کھلانے والے کو ہی ایسی موت کا منہ کیوں دیکھنا پڑتا ہے .....

اگر ہو سکے تو — اگر قضا و قدر کے جابر اور صاحب اختیار کارکن آپ کو اجازت دے دیں تو میرے سوال کا جواب ضرور بھیج دیجیے گا —

آپ کے ساتھ ان گنت ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے — میں نے آپ کے دروازے کی گھنٹی بجائی — گہری خاموشی کو اس آواز نے اور گہرا کر دیا تھا — پھر کسی کے گھسٹنے کی آواز..... دلخراش آواز.....

پھر دروازہ کھلا، آپ اپنی ہی موت کی تصویر بنے کھڑے تھے — جب میں نے ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد آپ کو حوصلہ رکھنے اور صحت کی بحالی کا یقین دلاتے ہوئے کہا تھا:

"شاہ جی! آپ تو دوسروں کو زندہ رہنے کا پیغام دیتے رہے - آپ بیماریوں سے کیوں گھبرا گئے، آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے —" تو آپ نے کوئی جواب نہ دیا تھا — آپ کی آنکھوں کے آنسو میری ساری تسلیوں کو بہا کر لے گئے تھے .....

میں نے زندگی میں ان گنت ملاقاتوں میں پہلی بار آپ کو روتے دیکھا تھا. آپ اپنے لیے نہیں..... ان بچوں کے لیے رو رہے تھے جن کا واحد سہارا آپ تھے — وہ بچے جو ابھی چھوٹے ہیں — جنہوں نے ابھی زندگی کے نشیب و فراز کا اندازہ بھی نہیں کیا —

مگر نہیں..... آپ شاید اس معاشرے پر آنسو بہا رہے تھے جس میں شاعر کے نغمے ہونٹوں پر گونجتے ہیں، مگر شاعر کو ناقدری اور بیماری کی صلیب پر مصلوب کر دیا جاتا ہے!

آپ اس خواب کے ٹوٹ جانے پر رو رہے تھے جو آپ نے اپنے خوب صورت اور زندہ رہنے والے شعروں میں دیکھا تھا — ایک خوشحال معاشرے کا خواب، جس میں بچے اپنے باپ کی موت کے بعد بے آسرا اور بے سہارا نہیں ہو جاتے. جب باپ بیمار ہو جائے، اس کی صحت جواب دے دے تو اسے یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ اس کی موت کے بعد اس کے بچوں کا مستقبل تاریک ہوگا — اسے یہ فکر نہیں ہوتی کہ اس کے بچے تحفظ سے محروم ہیں -

آپ کے آنسوؤں نے سب کہانیاں سنا دی تھیں — آپ تو ایک مدت سے زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھے — اس کشمکش میں انسان جو مایوسی، جو دکھ

اور جو کرب محسوس کرتا ہے ــ وہ آپ کے گیتوں میں ڈھل رہا تھا ــ آپ ہی نے تو ایک گیت لکھا تھا ؎

زندگی جا چھوڑ دے پیچھا میرا
آخر میں انسان ہوں،
پتھر تو نہیں ......

شاہ جی،
آپ واقعی پتھر نہیں تھے، انسان تھے ــ ورنہ ہمارے ملک اور ہمارے معاشرے میں تو پتھر بھی اپنی قدر و قیمت رکھتا ہے ــ انسان اور شاعر نہیں ــ پتھر تو اس معاشرے میں اپنا یا کسی کا سر پھوڑنے کے کام آ سکتا ہے ــ شاعر اور انسان کا اس معاشرے میں کیا مصرف ہے؟

بہرحال شاہ جی، آپ تو اپنی سی کر گزرے، راتوں کو جاگ کر، دنوں کو شاموں میں بدل کر آپ تو شعر کہتے رہے، نغمے لکھتے رہے، مگر آپ کی زندگی ایک نوحہ بن کر رہ گئی ــ

یہ شہر یوں ہی بستا رہا ہے، بستا رہے گا، آپ کے گیت گونجتے رہے ہیں، گونجتے رہیں گے ــ آپ کے اس طرح مر جانے سے دنیا تو اسی طرح رہے گی ــ ہم لفظوں، رنگوں اور آوازوں میں اپنی جان کھپانے والے لوگ، اس دنیا میں پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں؟

آپ نے کبھی کسی کی تحقیر اور تذلیل گوارا نہیں کی تھی ــ جب تک زندہ رہے دوسروں کے کام آتے رہے ــ مگر آپ کی زندگی کے ساتھ، آپ کی زندگی کے آخری ایام میں ہم نے، معاشرے نے جو سلوک کیا ہے، اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو اپنے آپ کو، سب کو مجرم پاتا ہوں......

میں آپ کے نام آخری خط لکھ رہا ہوں تو یہ خط بھی میرا احساسِ جرم ہی مجھ سے لکھوا رہا ہے یا اس موت کا خوف — جس کا تصور مجھے لرزا رہا ہے، جب آپ جیسے لوگ — جو معاشرے کی روح ہوتے ہیں — ان کو معاشرہ اس طرح بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے تو ہم جو معمولی سے قلمکار ہیں، ہمارے ساتھ زمانہ جو چاہے سلوک کرے.....

شاہ جی،

آپ عظیم تھے — آپ بہت بڑے شاعر تھے — آپ کے نغمے آپ کے فن کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ نغمے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور حساس دلوں کو یاد دلاتے رہیں گے کہ ایک خوب صورت زندگی کے جذبوں سے مچلتے ہوئے شاعر کو ایک زمانے نے، ایک معاشرے نے بے بسی کی موت مرنے کے لیے لاچار اور بیکار بنا کر نظر انداز کر دیا تھا۔

آپ نے اپنے ایک گیت میں کہا تھا:

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو،

آپ کے گیتوں میں آپ کا لہو ہے — انسانی جذبوں کا رچاؤ اور انقلاب کا رچز ہے — آپ دیوتاؤں کی چوکھٹ پر شہید ہو گئے ہیں۔

آپ کا لہو بھی رنگ لائے گا — معاشرے نے آپ کو بیماری اور بے بسی کی موت دی مگر آپ نے معاشرے کا دامن اپنے لہو سے گلنار کر دیا ہے۔

شاہ جی،

آپ کو اپنی زندگی میں مختلف وجوہات اور اسباب کی بنا پر مکان تبدیل کرنے کا بڑا شوق تھا — دوسرے تیسرے مہینے پتا چلتا تھا کہ آپ نے اپنی رہائش تبدیل کر لی ہے — آپ کی اس عادت پر دوست احباب خوب ہنسا کرتے تھے۔ مکان

بدلنے کے عمل کے پیچھے آپ کے ذہن کا اضطراب، بے اطمینانی اور بے یقینی کارفرما تھے۔ جو آپ کو کہیں ٹکنے نہ دیتے تھے — ساری عمر آپ بے گھر رہے۔ ساری عمر آپ کو چین نصیب نہ ہوا۔

شاہ جی،

مبارک ہو آپ کو ایک "مستقل گھر" مل گیا ہے، "مستقل مکان" قبر کے لیے دو گز زمین — اب آپ کو اپنا گھر تبدیل نہ کرنا پڑے گا— آپ کو ٹھکانا مل گیا.....
خدا کرے، میرا یہ خط— آپ کو آپ کے نئے "مکان" پر مل جائے —

آپ کا
ستار طاہر

ایس ڈی برمن

سچن دا — جو عام طور پر ایس۔ ڈی۔ برمن کے نام سے مقبول تھے، ان کا
پچھلے دنوں انتقال ہو گیا — ان کی عمر ۷۶ برس کے لگ بھگ تھی — وہ کومیلا
(مشرقی پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے اور ایک چھوٹی سی ریاست کے ولی عہد
تھے — ظاہر ہے ان کی تربیت راجواڑوں اور ولی عہدوں کی طرح ہوئی تھی۔
وہ موسیقی کے سچے عاشق تھے۔ اسی لیے موسیقی کے لیے انہوں نے سب
کچھ تج دیا — پہلے انہوں نے بنگالی فلموں میں موسیقی دی اور پھر بمبئی چلے آئے
ان کی پہلی اردو فلم جس کے لیے انہوں نے موسیقی ترتیب دی۔ "شکاری" تھی۔
وہ منفرد انداز کے موسیقار تھے — وہ خود بھی بہت اچھے گلوکار تھے — انہوں نے
دھیمے سُروں میں بھٹیالی کے رنگ میں جو گیت گائے ہیں۔ وہ ہمیشہ کانوں میں
رس گھولتے رہیں گے — ایک زمانہ میں ساحر لدھیانوی اور ایس۔ ڈی۔ برمن کی
جوڑی بڑی مشہور ہوئی تھی — ساحر لدھیانوی کے گیتوں کو ایس۔ ڈی۔ برمن نے
بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا تھا — ایسی کتنی ہی فلمیں ہیں جو ایس۔ ڈی۔
برمن کے میوزک اور ساحر کے گیتوں کی وجہ سے مقبول ہوئیں — بعد میں اختلافات
کی وجہ سے ساحر لدھیانوی اور ایس ڈی۔ برمن کی جوڑی ٹوٹ گئی — لیکن دونوں
کے دلوں میں ایک دوسرے کا احترام باقی رہا — ساحر لدھیانوی نے ایس۔ ڈی برمن

پر ایک بہت اچھا مضمون بھی لکھا تھا جو "شاہراہ" دہلی میں شائع ہوا تھا۔ جس میں ساحر نے ایس۔ ڈی۔ برمن کی عظیم شخصیت کی بعض جھلکیاں دکھائی تھیں۔

ایس۔ڈی۔ برمن کا فلمی صنعت میں بے حد احترام تھا — انہیں سب احترام سے "سچن دا" کہتے تھے — یعنی بڑا بھائی —

سچن دا کے بیٹے آر۔ڈی۔ برمن نے بھی فلمی سنگیت میں بڑا نام کمایا ہے۔ وہ آج بھی بھارت کے مقبول ترین موسیقاروں میں شمار ہوتے ہیں —۔

آر۔ڈی۔ برمن کا انداز سچن دا سے بے حد مختلف ہے۔ وہ مغربی موسیقی سے زیادہ متاثر ہیں اور خاص طور پر POP موسیقی کو انہوں نے بھارتی فلموں میں بڑی خوبصورتی سے متعارف کرایا ہے۔ یوں، برمن خاندان میں موسیقی کی روایت آگے بڑھی ہے اور سچن دیو برمن کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوئی —

کس کس کا نوحہ لکھیں

بھا اسمٰعیل

فیروز نظامی

بات جھٹلانے کی نہیں، احساسات کی ہے اور ایک ہی بات کے کئی رُخ بھی تو ہوتے ہیں —

شیخ سعدیؒ کی ایک حکایت ہے کہ جب ایک شکاری کے تیر کی زد میں ایک ہرن آیا تو ہرن نے گڑگڑا کر کہا:

"دنیا مر جائے گی۔"

شکاری نے ہنس کر کہا:

"تمہارے مرنے سے ساری دنیا کس طرح مر سکتی ہے؟"

ہرن نے جواب دیا:

"جناب، میں مر گیا تو میرے لیے ساری دنیا مر گئی۔"

یہ حکایت یوں بھی دل کو تڑپاتی ہے کہ بعض لوگوں کو یہ دنیا والے جس میں ہم زندہ ہیں، ان کی زندگی میں ہی مار دیتے ہیں —

اور ایک ہم ہیں کہ اب یوں لگتا ہے کہ جیسے ایک ہی کام رہ گیا ہے کہ مرنے والوں کا نوحہ لکھتے جائیں اور زمانے کی ناقدرشناسی کا بے کار رونا جاری رکھیں۔

لیکن اب اسے کیا کہیے کہ یہ دنیا — رجال سے خالی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ پچھلے

چند برسوں میں ہم میں سے ایسی ایسی ہستیاں اٹھ گئیں جو اپنے اپنے شعبوں میں یکتا تھیں جو اپنی مثال آپ تھیں۔

فیروز نظامی بھی پچھلے دنوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کچھ عرصہ پہلے انہیں ڈھنگ کا کام ملا تھا اور ہم جیسے لوگوں نے یہ امید باندھی تھی کہ فیروز نظامی جیسے منفرد موسیقار کے ذریعے اس ملک کی قدیم موسیقی کے عظیم سرمائے کو کسی طرح محفوظ کر لیا جائے گا۔ فیروز نظامی ــــ عرصے سے اپنے آپ سے جنگ میں مصروف تھے۔ موسیقی کی دنیا میں وہ جو کچھ کہنا اور کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے وسائل ان کا ساتھ نہ دیتے تھے ــــ ناقدری کے اس عالم میں وہ جیتے رہے، مرتے رہے۔ ایک فلم بنائی، جو باکس آفس پر "کلک" نہ ہوئی ــــ مرحوم کی شخصیت کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ وہ "ذہنی سائنس" کا بڑا پرچار کرتے تھے ــــ دوسروں میں قوت ارادی پیدا کرتے تھے اور خود ناقدری کا شکار ہونے کے باوجود شاید اسی خود اعتمادی کے سہارے زندہ تھے مگر وہ جو ان کے قریب تھے، وہ جانتے تھے کہ برصغیر کے موسیقاروں میں، یہ ایک پڑھا لکھا منفرد موسیقار ــــ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ مایوسیوں نے اس کو گھیرے میں لے رکھا ہے، لیکن وہ زندگی کی جنگ لڑتا جا رہا ہے۔

❀ ❀ ❀

فیروز نظامی کی وفات کے بعد ــــ بجا اسمٰعیل ایم اسمٰعیل بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب اگر میرے جیسا شخص کہے کہ اگر ایم اسمٰعیل کسی دوسرے قدر شناس معاشرے میں پیدا ہوتے تو اس وقت تک ان کی شخصیت اور فن پر سینکڑوں کتابیں چھپ چکی ہوتیں۔ ان کی زندگی میں ہی ان کو بڑے سے بڑا اعزاز مل چکا ہوتا۔ وہ پورے معاشرے کی آنکھ کا تارا بنے ہوتے اور جب اس دنیا سے سفر کرتے تو اس پورے معاشرے میں سوگ منایا جاتا، لیکن ایم اسمٰعیل ــــ اس معاشرے میں پیدا ہوئے تھے جو قدر شناسی

کے معاملے میں دنیا کا شاید سب سے متعصب معاشرہ ہے۔

ایم اسمٰعیل ایک تاریخ تھے تاریخ ساز بھی اور فلمی صنعت کے ان چند عظیم فنکاروں میں سے تھے، جنہوں نے نہ صرف خاموش فلموں کے دور میں اداکاری کے جوہر دکھلائے بلکہ "ٹاکی" کا دور آیا تو اس میں بھی سرفہرست رہے۔

وہ بہت اچھے پینٹر بھی تھے۔ شاید بہت کم لوگوں کو اب یاد ہوگا کہ جب منٹو کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "منٹو کے افسانے" شائع ہونے والا تھا تو اس کا سرورق بنانے کے لیے منٹو مرحوم نے ایم اسمٰعیل سے کہا تھا: "ٹائٹیل پر میرا جو سکیچ بنے، اس میں میری گردن خوب اکڑی ہوئی ہونی چاہیے۔" اور ایم اسمٰعیل مرحوم نے منٹو مرحوم کی خواہش کے مین مطابق کتاب کا ٹائٹل تیار کیا تھا۔

ایم اسمٰعیل مرحوم اداکاری کے اس سکول کے فن کار تھے، جس میں اداکار کی اپنی شخصیت ختم ہو جاتی ہے اور کردار زندہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح بعض بڑے مصنف اپنے بعض کرداروں کے حوالے سے لازوال شہرت کے مالک بنتے ہیں۔ اسی طرح بڑے فن کار بھی اپنے بعض کرداروں کے حوالے سے زندہ رہتے ہیں۔ "ہیر رانجھا" میں ایم اسمٰعیل مرحوم نے "کیدو" کا کردار ادا کیا تھا۔ اس کردار کو ان کے بعد کئی دوسرے بڑے فنکاروں نے بھی کیا۔ لیکن وہ "کیدو" جسے ایم اسمٰعیل نے پیش کیا تھا۔ لوگ کئی دہائیاں گزر جانے کے باوجود اب تک یاد رکھتے ہیں اور اس حوالے سے ایم اسمٰعیل ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

"خزانچی" میں انہوں نے جو کردار ادا کیا۔ وہ بھی ہمیشہ یاد رہنے والے کرداروں میں ایک ہے۔ قیام پاکستان کے بعد "قسمت" میں ایک نسیان کے مریض کا جو کردار ایم اسمٰعیل نے ادا کیا، وہ اداکاری کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ایم اسمٰعیل ایک بڑے فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک وضعدار اور خود دار انسان تھے ۔۔۔ موجودہ دور میں جو اداکاری رائج ہے، اس سے سمجھوتہ نہ کر سکتے تھے۔

اور پھر اس ملک کی فلمی صنعت نے اپنے سینئر ترین فن کار کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ بے کاری کے دنوں میں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی، انہوں نے کسی کا گلہ نہیں کیا۔ وہ اپنی وضعداری اور خودداری کو نبھاتے رہے — وہ ماضی کی مزے دار باتیں سناتے تھے — ان کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا — وہ جن اکابرین کے ساتھ دوستیاں نبھاتے تھے، ہم نے تو ان کی آنکھیں بھی نہیں دیکھیں — ایم اسمٰعیل خوش ذوق انسان تھے — اب ذ سنوری سے ان کو بے حد لگاؤ تھا۔

ایم اسمٰعیل — سب کے بھا جی تھے — اب وہ مشفق بزرگ بڑا بھائی اس دنیا سے اُٹھ چکا ہے۔ اس ناقدر شناس معاشرہ میں ان کی شرافت، ان کی وضعداری اور ان کا عظیم فنی اسلوب کسی کام نہ آئے — لیکن فن کی دنیا میں انہوں نے جو عظیم نقوش چھوڑے ہیں، ان کو کوئی نہ مٹا سکے گا۔

مجھے یاد ہے، جب ایک بار اداکاروں کی انجمن کے انتخابات ہوئے اور انتخابات کے بعد اداکاروں کی انجمن کا پہلا افتتاحی اجلاس ہوا تو ایم اسمٰعیل مرحوم کو خصوصی مہمان اور صدر بنایا گیا — انہوں نے چند جملوں میں بات ختم کر دی تھی کہ انہیں تقریر کرنے کا فن نہیں آتا — وہ زیادہ باتیں کرنا نہیں جانتے۔ سب کے لیے دعا گو ہیں —

اور وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے اب بھی گھوم رہا ہے، جب طارق عزیز نے بھا جی کی عظمت اور بزرگی کے اعتراف کے طور پر اداکاروں کی انجمن کی طرف سے انہیں گلاب کا پھول پیش کیا تھا۔

بھا اسمٰعیل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

شاید وہ سوچ رہے ہوں کہ اس مادی دنیا میں گلاب کا پھول کس کام آتا ہے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ چلتے ان کی عظمت کا اعتراف، انہیں گلاب کا

پھول پیش کر کے کیا گیا — ان کا وہ بزرگ اور لانبا سراپا آنکھوں کے سامنے ہے ۔ انہوں نے گرم چادر اوڑھ رکھی تھی ۔ سر پر اُونی ٹوپی اور قمیص شلوار میں ملبوس تھے اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ بھا اسمٰعیل کو اداکاروں کی طرف سے گلاب کا پھول پیش کیا گیا تھا — ان کے لیے فلموں میں گنجائش نہ نکالی تھی اور دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بھا اسمٰعیل کی عمر کو دوسرے بیشتر اداکار پہنچیں گے تو کیا کوئی انہیں گلاب کا پھول پیش کر سکے گا ؟

ایک درویش ایک عاشق ایک فنکار

سائیں مرنا

وہ لوگ جنہیں اپنی زندگی میں سائیں مرنا سے ملنے کا کبھی بھی اتفاق ہوا ہو۔ وہ سائیں مرنا کے نقش کو اپنے دل سے کبھی مٹا نہیں سکتے ۔۔ سائیں مرنا ۔۔ درویش تھا۔ ایک فن کار تھا ۔۔ ایک عاشق تھا ۔۔ ایسا عاشق جس کی جمالیاتی حِس ہمیشہ بیدار رہتی تھی۔ وہ دنیا کی ہر خوب صورت چیز سے محبت کرتا تھا۔

وہ اکتارا بجاتا تھا ۔۔ ایک تار کا ساز ۔۔ جس میں اس نے اپنی فطری خلاقی اور جودتِ طبع سے کام لے کر کچھ اضافے بھی کیے تھے۔ وہ ان فن کاروں میں سے ایک تھا، جو اپنے فن میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں، جو اپنے فن سے سب سے زیادہ خود ہی لطف اندوز ہوتے ہیں ۔۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو فن کی دنیا میں ایک نئی طرح، نیا اسلوب، نیا انداز اور آہنگ لے کر آتے ہیں جو خود خواب آسا زندگی گزارتے اور خواب ساز ہوتے ہیں ۔۔ hanmh NSY . ا کے الفاظ ہیں:

WE ARE DREAMS, DREAMERS AND DREAMMAKERS.

وہ اپنے آپ کو فن میں اس طرح ڈبو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے فن کی کبھی

اس طرح سے نمائش نہ کی۔ اس کا اس طرح سے اظہار نہ کیا جو شو بزنس کا ایک طرح سے لازمی عنصر بن چکا ہے۔ وہ کبھی اپنا اشتہار نہ بنے اور اس سے زیادہ بے نیازی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے کبھی اپنا فن محفوظ کرانے کی کوشش نہ کی۔ ایوب رومانی بتا رہے تھے کہ ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کا فن ٹیپ میں محفوظ کر لیا جائے، لیکن سائیں مرنا کبھی ان کی ایک نہ مانتے تھے۔

جب بھی انہیں کہا جاتا کہ کچھ ریکارڈ کرنا ہے تو سائیں مرنا ٹال دے جاتے۔ ان کے عظیم فن کی صرف ایک یا دو یادگاریں محفوظ ہیں اور ایک پروگرام میں جو ٹیپ سنائی گئی وہ سائیں مرنا کے فن کا وہ فن پارہ ہے جو ایوب رومانی نے ان سے ایک عجیب بہانے سے ریکارڈ کروایا تھا اور یہ اس فنکار کی یادگار ہے۔

جو بچپن کے لیے بڑے شوق سے اکتارہ بجایا کرتا تھا جسے ایک محفل میں جب وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا تو کسی نے کوئی فرمائش کر دی کہ سائیں جی وہ راگ سنائیں تو اس کے جنبش میں آئے ہوئے وہ ہاتھ رک گئے کہ وہ اپنے لیے اکتارا بجاتا اور اس بے خودی سے اکتارا بجاتا کہ اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی گانے لگتا اور وہ جو گاتا۔۔۔

وہ پنجاب کے عظیم صوفی شعرا کا کلام ہوتا تھا۔

شاہ حسین، سلطان باہو اور بابا بلھے شاہ کا کلام اسے ڈھیروں یاد تھا۔ وہ اپنی ہی موج کا آدمی تھا۔۔۔ ایسا آدمی، ایسا فن کار، جو خریدا نہیں جا سکتا، جسے جھکایا نہیں جا سکتا جو خود ہی جھک جایا کرتا ہے، خود ہی بک جاتا ہے۔

ایوب رومانی بتا رہے تھے کہ ریڈیو پر ہر سال کل پاکستان موسیقی کانفرنس ہوا کرتی تھی۔۔ سائیں مرنا بھی اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔۔۔ ایک بار ایسا ہوا کہ جب کانفرنس کا اہتمام کیا جا رہا تھا تو حسب معمول سائیں مرنا کو بھی شرکت کی دعوت دی

گئی کہ ان کی شرکت کے بغیر یہ کل پاکستان میوزک کانفرنس کس طرح کامیاب ہو سکتی تھی، لیکن خلافِ معمول سائیں مرنا نے اس برس اس میوزک کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔

بڑا اصرار کیا گیا، لیکن سائیں مرنا نے انکار ہی کیا اور کسی کے اصرار یا دباؤ پر انکار کو اقرار میں نہ بدلا۔ لیکن جس روز وہ کانفرنس ہونے والی تھی، اس کے وقت سے کچھ پہلے دیکھا کہ سائیں مرنا اپنا اکتارا سنبھالے چلا آ رہا ہے۔ منتظمین کو بے حد خوشی ہوئی۔ انہیں کہا گیا، سائیں جی آپ نے تو انکار کر دیا تھا۔ کسی بے حد ضروری کام کا عذر کیا تھا، لیکن اب آپ.....

سائیں مرنا نے جواب دیا:

"میں تو لیلیٰ سے ملنے آیا ہوں، لیلیٰ کو دیکھنے آیا ہوں۔ میں نے پروگرام کے کارڈ میں پڑھا کہ لیلیٰ یہاں آئی ہے......

سائیں مرنا، جس لیلیٰ کو دیکھنے اور سننے آئے تھے۔ وہ تھیں، مشہور مغنیہ لیلیٰ ارجمند بانو۔

اور پھر اس شام کو سائیں مرنا نے جو کچھ بجایا، وہ انوکھا تھا۔ وہ ایک انوکھی سی ہیجانی کیفیت لیے ہوئے تھا۔

سائیں مرنا۔ کا وہ واقعہ تو بے حد مشہور ہے، جس کی وجہ سے ریڈیو سٹیشن لاہور کے بعض حکام کی پیشیاں تک ہو گئی تھیں۔

ہمارے ملک کی ایک بہت بڑی مغنیہ ہیں، اب بھی بقیدِ حیات ہیں۔ اب بھی ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے ان کی آواز سارے ملک میں گونجتی رہتی ہے۔ اب بھی وہ غزل کی گائیکی میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔ یہ فنکارہ ایک بار جب ریڈیو کے ایک LIVE پروگرام میں گا رہی تھیں تو سائیں مرنا۔ سٹوڈیو کے اندر کسی

طرح داخل ہو گئے۔۔ سائیں مرنا نے جذب و جنون کے ساتھ ایک جملہ بڑی وارفتگی سے کہا، جس کا مفہوم کچھ یوں تھا:

"میں تم پر ہی مرتا ہوں اور اسی لیے میرا نام مرنا ہے۔"

وہ لوگ جو اس وقت اُس بڑی مغنیہ کی غزل سُن رہے تھے، انھوں نے سائیں مرنا کے اظہارِ عشق کو سنا۔ عشق کے اظہار کی یہ صدا۔۔ ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی جانے کہاں کہاں گھوم گئی، پھیل گئی۔۔ گانے والی مغنیہ نے غزل روک دی۔۔ اس کے بعد کچھ گفتنی ناگفتنی کے سلسلے میں بہت کچھ کہا سُنا جاتا ہے۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ سائیں مرنا کے اس انداز اس اظہارِ عشق نے ریڈیو کے کئی ذمہ دار لوگوں کے لیے مصیبت کھڑی کر دی کہ آخر سائیں مرنا۔۔ سٹوڈیو کے اندر داخل کس طرح ہوئے، جب کہ معمول کے مطابق سٹوڈیو میں کوئی گا رہا ہو یا کوئی اور پروگرام ہو رہا ہو تو کسی کو اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی اور عموماً سٹوڈیوز کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا جاتا ہے۔

سائیں مرنا کے بارے میں بہت کچھ کہا بہت کچھ سُنا گیا ہے۔۔ انھیں ہر شے سے جو خوب صورت تھی، عشق ہو جاتا تھا۔۔ وہ فنا فی العشق تھے اور موت کی پروا نہ کرتے تھے کہ ان کا نام ہی سائیں مرنا تھا، لیکن وہ زندگی سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ زندگی کے ایک ایک لمحے کا رس چوستے تھے۔۔ وہ ایسا درویش تھا۔۔ ایسا انسان تھا کہ جس نے جوگ لے لیا تھا۔۔ جس نے اپنے اکتارے کو اپنی زندگی بنا لیا تھا۔۔

ایوب رومانی بتا رہے تھے کہ انھیں اپنے فن پر بے حد اعتماد تھا۔۔ وہ پہلی بار بغیر کسی دعوت، کسی پیش کش اور شناسائی کے ریڈیو اسٹیشن پر آ گئے اور پنجابی میں کہنے لگے کہ مجھے ریڈیو پر اکتارا بجانا ہے۔۔ لوگ سمجھے کہ یہ کوئی بہت ہی عجیب المخلقت

آدمی ہے — ایسے ایسے کئی شوقین ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگاتے رہتے ہیں اور شوق
فضول ہی کے ہاتھوں رسوا ہوتے ہیں — یہ بھی ان میں سے کوئی ہے — سائیں مرنا
کو کہا گیا کہ وہ آڈیشن کے دن آئیں، لیکن وہ درویش کہاں سنتا تھا —

اب ریڈیو کے متعلقہ لوگوں نے سوچا کہ اس سے "گلو خلاصی" کرائی جائے
یہ کیا بجائے گا؟

لیکن جس لگن، بے خودی، استغراق اور خود اعتمادی سے سائیں مرنا نے
اکتارا بجایا، اس سے سب مسحور ہو کر رہ گئے۔ اکتارا — سائیں مرنا نے حرزِ جان
بنا لیا تھا — وہ اکتارا بجاتا رہا — زندہ رہا — مجازی دنیا کے چراغ جلاتا رہا — مجاز سے
حقیقت کا سفر طے کرتا رہا — وہ طریقت کے راستے پہ چلتا رہا۔

اور ایک دن مر گیا — لیکن وہ مرا نہیں ہے — وہ مر ہی نہیں سکتا — وہ
سائیں مرنا تھا اور وہ جسے موت نہیں آتی — وہ درویش تھا، فنکار تھا — بے نیاز۔
اپنے آپ سے اور اپنے فن میں گم، اور زندہ ہوا۔

ایک بار کسی نے اُن سے پوچھا کہ سائیں جی — آپ اپنے فن کی کوئی کہانی تو
چھوڑ جائیں، پھر لوگ آپ کو کیسے جانیں اور کیسے یاد رکھیں گے؟

راوی بتاتا ہے کہ سائیں مرنا نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا:

"بھلایا اُسے جاتا ہے جو بھلایا جا سکے اور موت اُسے آتی ہے جو
موت سے ڈرتا ہو — میں تو اب بھی مرتا ہوں اور مرنے کے بعد
بھی مرتا ہی رہوں گا اور جب میں لوگوں کے ذہن اور نظریے کے مطابق
مر جاؤں گا تو تم دیکھنا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ لوگ میری
پرستش کریں گے۔"

سائیں مرنا کو ایک بڑی حقیقت کا شعور حاصل تھا کہ عوامی فن کار، لوک فن

ہو رہنا — جیسے گمنام ہو جائے لیکن کبھی مرتا نہیں — وہ صدیوں کی روح میں اتر جاتا ہے اور زندگی — دائمی زندگی — جو موت کی طرح ہی ایک اٹل حقیقت ہے، کا روپ دھار کر زندہ رہتا ہے اور صدیوں تک اس کی پرستش کی جاتی ہے —

پی جی وڈ ہاؤس

وٹوریا ڈی سیکا

وہ لوگ جنہوں نے پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس کے شگفتہ اور مزاحیہ ناول اور JEEVES کہانیاں پڑھی ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے وٹوریو ڈی سیکا کی فلمیں دیکھی ہیں، وہ شاید معترض ہوں کہ ان دونوں میں قدر مشترک کیا تھی ــــ وڈ ہاؤس کا شمار انگریزی کے عالمی شہرت یافتہ مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ایک صدی کے لگ بھگ ــــ انہوں نے عمر پائی ــــ اور جتنے برس عمر پائی، اس سے زیادہ کتابیں لکھیں ــــ بانوے برس کے ہوتے اور آٹھ کم سو برس کی سالگرہ منائی تو اس سالگرہ کے موقع پر ان کا نیا ناول شائع ہوا تھا اور یہ ان کی نویں کتاب تھی ــــ کتاب کے ڈسٹ کور کے بیک ٹائیٹل پر ان کی نئی اور تازہ رنگین تصویر شائع ہوئی تھی اور وہ اپنے پورے گنجے سر کے ساتھ معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے اور ایک بلی کو گود میں لیا ہوا تھا، دوسرے ہاتھ میں پائپ تھا ــــ ایک برطانوی مزاح نگار کی مکمل تصویر ــــ اس برس کرسمس کے موقع پر برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کی طرف سے روایت کے مطابق کئی لوگوں کو "نائٹ ہڈ" یعنی سر کے خطابات دیے ــــ ان میں پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس اور چارلی چیپلن بھی شامل تھے ــــ برطانیہ میں وہ شخص بڑا محترم سمجھا جاتا ہے جس کو یہ خطاب ملا ہو، برصغیر کے لوگ تو اس "سر" کی حیثیت سے خوب واقف ہیں کہ برطانوی راج میں

جسے سر کا خطاب ملتا تھا، وہ برطانوی حکومت کا "یار" اور نمک خوار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن برطانیہ کے شہریوں کو خطاب واقعی ان کی عظیم خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا ہے۔ (چمچوں اور خوشامدیوں کو نہیں) پی۔جی۔ وڈ ہاؤس جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مزاح نگار کے لیے یہ اعزاز کوئی معنی نہیں رکھتا تھا — اس لیے اس سر کے خطاب ملنے پر انہوں نے کہا تھا:

"میں یہ خطاب ملنے پر اس لیے خوش ہوا ہوں کہ اب میری بیوی 'لیڈی' بن گئی ہے۔"

اس جملے میں بھی پی۔جی۔ وڈ ہاؤس کا مخصوص انداز کا مزاح جھلکتا ہے۔

وٹوریو ڈی سیکا۔ اٹلی کے فلمساز اور ہدایت کار تھے — دوسری جنگ عظیم کے بعد اٹلی ایک خرابے کی صورت اختیار کر چکا تھا — فاشزم نے اس ملک کو تباہ کر دیا تھا چاروں طرف غربت اور بدحالی تھی — اس دور میں چند لوگ سامنے آئے جن میں وٹوریو ڈی سیکا — سرفہرست تھے۔ انہوں نے کم بجٹ کی فلمیں بنا نا شروع کیں اور ایک نئے دبستان اور مکتب فکر کو جنم دیا جسے فلم سازی کی تاریخ میں NEO - REALISM یعنی نو واقعیت کا نام دیا جاتا ہے — ان فلموں میں اٹلی کی صورت حال کو انسانی اور فنی کارانہ نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا اور اٹلی میں صنعت فلم سازی کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا — ایک ایسا دور — جو اس سے پہلے نہ صرف اٹلی کی تاریخ میں — بلکہ عالمی سینما کی تاریخ میں بھی درخشاں باب کی حیثیت رکھتا ہے — وٹوریو ڈی سیکا نے جنگ زدہ اٹلی کی دنیا اور جنگ عظیم سے متاثرہ دنیا کو سیلولائڈ پر منتقل کیا اور حقیقت پسندی کا ایک نیا معیار قائم کیا۔

معترض اور نقص بین "کو اعتراض ہوگا کہ بھلا — پی۔جی۔ وڈ ہاؤس جیسے مزاح نگار اور وٹوریو ڈی سیکا جیسے ہدایت کار اور واقعیت پسندی کے پرچارک میں کون سی قدر مشترک ہے — نہیں صاحب کچھ بات نہیں بنی آپ زبردستی کی کڑیاں ملاتے ہوئے۔ اپنے ہی ہاتھوں مارے جا رہے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے پی۔جی۔ وڈ ہاؤس اور

وٹوریوڈی سیکا کے درمیان گہرا ربط موجود ہے — دونوں اپنے اپنے دور کے عظیم خالق تھے
دونوں نے ایسی کتابیں اور ایسی فلمیں تخلیق کیں جو ادب اور فلم میں زندہ رہنے کی سکت رکھتی
ہیں — دونوں نے شہرتِ دوام کے دربار میں — ابدی عظمتوں کے نقش چھوڑے ہیں۔
دونوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا ہے اور ان دونوں کے کام کو ملا کر دیکھا جائے تو ایک
ایسی تصویر بنتی ہے جسے زندگی کی مکمل تصویر کہا جا سکتا ہے۔

پی۔ جی۔ ووڈ ہاؤس اور وٹوریوڈی سیکا — دو مختلف ملکوں، دو مختلف تہذیبوں اور دو
مختلف زبانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انسانیت کی قدریں مشترک تھیں۔
دونوں بڑے تخلیقی فن کار ہونے کے ناطے سے ایک ہی منصب کو پورا کر رہے تھے۔
انسانی زندگی کو آسودگی اور معنی خیزی بخشنے کی سعی — دونوں نے تاریخِ عالم کا پُر آشوب
دور دیکھا تھا — پہلی جنگِ عظیم اور پھر دنیا کی سب سے بڑی جنگ — دوسری جنگِ عظیم۔
دوسری جنگِ عظیم میں جہاں برطانیہ نے جرمنوں کے ہاتھوں زخم کھایا وہاں اٹلی پر فاشزم
کا جھنڈا لہراتا رہا اور پھر اتحادیوں نے اس کو تسخیر کرتے وقت برباد کر دیا۔ دونوں — نے
اپنے سامنے دنیا کو بگڑتے اور مٹتے دیکھا تھا۔ پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس — انسانی تباہیوں کے
کھنڈر پر کھڑا انسان کی شگفتہ مزاجی اور مزاح کی حس کو زندہ رکھنے میں کامیاب رہا — اور
وٹوریوڈی سیکا انسانی احساسات کے دوسرے رُخ کو نمایاں کرتا رہا — غربت و افلاس
اور جنگ سے متاثرہ دنیا کو سیلولائیڈ پر لاتے ہوئے انسانی عظمت کو نمایاں کرتا رہا۔
پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس کے ناول چھپتے رہے اور اس روتی اور سسکتی ہوئی دنیا کو مسکرانے پر
مجبور کرتے رہے۔ وٹوریوڈی سیکا کی فلمیں بنتی رہیں اور وہ انسانوں کو انسانوں کی اہمیت
اور ایثار کی کہانیاں سناتی رہیں —

وٹوریوڈی سیکا کی فلم "بائیسکل تھیف" عالمی سینما میں ایک سنگِ میل کی حیثیت
رکھتی ہے — دوسری جنگِ عظیم کے بعد کا اٹلی اس میں زندۂ جاوید ہو گیا ہے —

انسانی مجبوریاں اور رشتوں کی عالمگیر کہانی اس فلم میں بیان کی گئی ہے۔ اس فلم نے ساری دنیا کو چونکایا — اور صنعت فلم سازی کا رخ موڑ دیا اس کے بعد — وٹوریو ڈی سیکا نے TWO WOMEN جیسی فلم تخلیق کی۔ البرتو موراویا کے اس ناول کو فلما کر اس نے انسانوں کو جنگ سے نفرت کرنا سکھائی — ایک ماں ہے جو اپنی عزت کا نیلام اٹھا کر بھی اپنی بیٹی کی عصمت بچانا چاہتی ہے، لیکن جنگ کا دیوتا، انسانی تقدس اور عصمتوں کی کوئی پروا نہیں کرتا اور گدھے ہیں — بیٹی کی عزت لوٹ لی جاتی ہے۔ فوجی پاہی ہوس کے ہاتھوں اندھے اس نازک اور کومل جذبے کو قتل کر دیتے ہیں جسے ایک ماں نے مر مر کر اپنے دل میں پالا تھا — "دو عورتیں" کے ذریعے دنیا کو ایک بڑی اداکارہ ملی — صوفیہ لورین سیکس سمبل کی حیثیت سے مشہور تھی۔ لیکن "دو عورتیں" میں اس نے ایسی پرفارمنس دی کہ وہ فرش سے اٹھ کر اداکاری کے عرش تک پہنچ گئی اور اسے آسکر ایوارڈ دیا گیا — پہلی بار کسی غیر ملکی اداکارہ کو اس اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ وٹوریو ڈی سیکا کی فلموں کی فہرست طویل ہے — بیسٹرڈ سے۔ ٹوڈے۔ ٹومارو)
میں اس نے طنز کا نشتر چلایا اور شادی کے موضوع پر ایک شاندار فلم بنائی اور عالمی سینما کو ماسٹر لیماسٹریو آنی جیسا اداکار دیا۔

ادھر پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس اپنے کرداروں ,JEEVES اور کہانیوں کے ذریعے دنیا کو آسودگی بخشتا رہا۔ اس نے شائستہ مزاح کو وہ ناز اور اسلوب تکمیل کی حدوں تک پہنچایا کہ جس کا ثانی اب تک دنیا کو نہ مل سکا اور یوں — دیکھا جائے تو وٹوریو ڈی سیکا اور پی جی وڈ ہاؤس دونوں زندگی کا ایک عظیم منصب ادا کر رہے تھے۔ زندگی کو آئینہ دکھانے کا منصب — زندگی میں جو حسن ہے اس کو نمایاں کرنے کا منصب۔ انسان کو انسان کی طرح زندہ رہنے کا درس دے رہے تھے — وہ انسان جس کا سائیکل بائیسکل تھیف میں چوری ہو گیا ہے اور وہ کھلے بازار میں اپنے بیٹے کے ساتھ ہراساں اور پریشان

گھوم رہا ہے۔ وہ انسان — پی جی۔ وڈ ہاؤس کی کہانیوں میں مسکراتا ہوا نظر آتا ہے اور کہتا ہے : "اس جنگل میں یہ بلبل کیسے آگئی —" انسانوں کے اس جنگل میں بلبل کا نغمہ بھی اسی طرح ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے، جس طرح اپنی بیٹی کی عصمت لٹ جانے پر چیختی ہوئی ایک عورت — زندگی کی تصویر آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے امتزاج سے بنتی ہے۔ زندگی کی تصویر تب مکمل ہوتی ہے جب اس میں سیاہ اور سفید — دونوں رنگ یک رنگ ہو گئے ہوں۔ زندگی صرف سنجیدگی نہیں بلکہ مسکراہٹ بھی ہے — اور پی۔جی۔ وڈ ہاؤس کے JEEVES ناولوں پر مبنی ٹی وی فلم کئی برسوں تک برطانیہ میں دکھائی جاتی رہی اور لوگ ہنستے رہے، انسانی حماقتوں کا شعور حاصل کرتے رہے — انسان کو انسان جب کچلتا ہے، اس پر ظلم کرتا ہے تو وہ ایک بڑی حماقت کا ارتکاب کرتا ہے اور — انسان کی یہی سنجیدہ اور تباہ کن حماقتیں — واڈیووڈی سیکا کی فلموں کا موضوع تھا۔

پی۔جی۔ وڈ ہاؤس اور وٹوریوڈی سیکا — انسان کے احساسِ جمال کو سیراب کرتے رہے۔ ان کو آسودگی سے ہمکنار کرتے ہوئے انسانوں کی طرح زندہ رہنے کا درس دیتے رہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا کی اس کائنات میں — سب سے بڑے خالق کے دیے ہوئے عطیے کو بروئے کار لا کر تخلیق کے پھول کھلاتے رہتے اور اقبال کی زبان میں : — ع ؎ تو شب آفریدی چراغ آفریدم

کہہ کر اپنی عظمت کا سکہ جماتے رہے۔

ہاورڈ ہیوز

ہاورڈ ہیوز دنیا کا پُراسرار ترین ارب پتی شخص تھا جس کا پچھلے دنوں انتقال ہو گیا۔ اس کا شمار دنیا کے چند بڑے دولت مندوں میں ہوتا ہے — دولت مند ہونا اتنی اہم بات نہیں جتنی یہ کہ وہ بے حد پُراسرار انسان تھا۔ جب وہ مرا تو اس کی عمر ستر برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک عجیب و غریب اور جرأت مند بہادر انسان تھا — وہ جاں باز ہوا باز تھا — ہوائی جہاز سے اسے عشق تھا — وہ ایک بہت بڑی صنعتی مملکت کا تاجدار تھا۔ اس کی دولت کا کچھ حساب نہیں — دنیا کی خوب صورت عورتوں کو صرف اپنا بنانے کے لیے بھی وہ بڑا ہٹ دھرم اور ضدی ثابت ہوا تھا —

اس کی سب سے زیادہ پُراسرار بات یہ تھی کہ وہ تنہائی پسند تھا — پچھلے دس برسوں سے کوئی شخص اس کے متعلق نہ جانتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیا کر رہا ہے۔ بعض لوگ ان دس برسوں میں اسے یوں بھلا بیٹھے تھے جیسے وہ مر چکا تھا۔ لیکن اب وہ حقیقی معنوں میں مرا ہے اور یہ ثابت ہوا ہے کہ پچھلے دس برسوں میں وہ تنہائی کی زندگی بسر کرتے ہوئے جی رہا تھا —

ہاورڈ ہیوز کی کوئی اولاد نہیں — اس نے دو بار شادی کی اور دونوں کو طلاق دے دی — ہاورڈ ہیوز نے فلمیں بھی بنائیں اور فلمی دنیا کی ان حسین ترین عورتوں کو بھی اپنایا؛ جن کی شہرت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی — وہ خوب صورت عورتوں کا دلدادہ تھا لیکن ان

عورتوں کو متعلق وہ دوسروں کے حق میں بھی نہیں تھا بلکہ انہیں برباد کر دیتا تھا — وہ
عورتیں جن کا اس کے ساتھ تعلق رہا وہ اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے گھبراتی
ہیں اور اب بھی جب وہ مر گیا ہے اس کے بارے میں کچھ زیادہ بتانے کے لیے آمادہ
نہیں ہیں —

ہاورڈ ہیوز نے پہلی شادی ۱۹۲۵ء میں کی جب وہ انیس برس کا جوان تھا
اس کی بیوی کا نام ایلا رائس تھا جو بڑی خوب صورت لڑکی تھی — چار برسوں کے بعد ان
میں طلاق ہو گئی — ۱۹۵۰ء میں ہاورڈ ہیوز نے دوسری شادی کی — اس کی یہ دوسری
بیوی جین پیٹرس تھی جس کی درجنوں فلموں کی نمائش پاکستان میں ہو چکی ہے جین پیٹرس
اپنے زمانے کی مشہور اور خوب صورت ترین اداکارہ تھی — ہاورڈ ہیوز سے شادی کے بعد
جین پیٹرس نے ہاورڈ ہیوز کی خواہش کے مطابق فلموں میں کام کرنا بند کر دیا اور دس برس
کے بعد ہاورڈ ہیوز اور اس کے درمیان طلاق واقع ہو گئی —

ہالی وڈ کی مشہور اداکارہ ٹیری مور کا دعویٰ ہے کہ اس سے بھی ہاورڈ ہیوز نے
شادی کی تھی — اس وقت ٹیری مور کو ہالی وڈ کی جنسی اپیل رکھنے والی پرکشش اداکارہ
سمجھا جاتا تھا اور ہاورڈ ہیوز کی عمر ۴۳ برس ہو چکی تھی — یہ شادی خفیہ رہی۔ ہاورڈ ہیوز
نے کبھی اس شادی کا اعتراف نہیں کیا — ہاورڈ ہیوز ایک حاسد مرد تھا — وہ یہ کبھی
برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ جس عورت کو وہ پسند کرتا ہے اسے دوسرا کوئی مرد بھی
دیکھے — وہ اس عورت کو ایک طرح سے قید کر دیتا تھا اور اس کے دنیا سے تمام
رشتے ختم کرا دیتا تھا — عالمی شہرت کی جن اداکاراؤں کے ساتھ ہاورڈ ہیوز کا تعلق رہا
ان میں کیتھرائن ہیپ برن، جنجر روجرز، لانا ٹرنر، آوا گارڈنر، آئیڈا لیوپینو، اولیویا ڈی
ہیولینڈ ہیں —

آوا گارڈنر جس کی ایک فلم عنوانی جنگلش کی فلم بندی [illegible] میں ہوئی تھی... تو اس

ئے ہاورڈ ہیوز کے ساتھ تعلقات رہے — ہاورڈ ہیوز نے آوا گارڈنر کی نگرانی اور جاسوسی کے لیے چار جاسوس ہمہ وقت مقرر کر رکھے تھے — آوا گارڈنر دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوتی، ہاورڈ ہیوز کے جاسوس اس کے ساتھ رہتے اور اس کی ایک ایک حرکت کی خبر اپنے آقا کو پہنچاتے —

ہاورڈ ہیوز نے دنیا کی خوب صورت ترین اداکاراؤں سے تعلق قائم کرنے کے لیے آر کے او سٹوڈیوز کو خرید لیا تھا اور جب اس نے ایک فلم "آوٹ لا" بنائی تو اس فلم میں اس نے جین رسل جیسی سیکسی اداکارہ کو پہلی بار پیش کیا تھا اور اسے جس انداز میں پیش کیا اس کے متعلق ہالی وڈ کے نقاد کہتے ہیں کہ اس فلم سے اداکاراؤں میں "کم لباس" پہننے کا رجحان شروع ہوا— عورتوں کے معاملے میں بھی اس کی فتوحات کا سلسلہ بڑا طویل ہے — وہ اپنی محبوبہ کو کسی سے ملنے نہ دیتا تھا، اگر وہ زیادہ ہی تنہائی محسوس کرتی تو اس کے رشتہ داروں کو پاس بلا لیتا تھا، لیکن کسی غیر کی موجودگی کو پسند نہ کرتا تھا—وہ اخباروں رسالوں میں جب کسی خوب صورت لڑکی کی تصویر دیکھتا، اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنے کارندے بھجوا دیتا — اس کے کارندے مختلف پوزوں میں اس کی تصویریں بنوا کر ہاورڈ ہیوز کو بھجوا دیتے — وہ انہیں پسند کر کے پانچ سو ڈالر فی ہفتہ تنخواہ پر سٹوڈیو میں ملازم رکھ لیتا— مدتیں گزر جاتیں اور ان خوب صورت لڑکیوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا اور انہیں باقاعدگی سے تنخواہ دی جاتی تھی — ۱۹۵۰ء میں آر کے او سٹوڈیوز کے چھوٹے حصہ داروں نے جب اس طرح دولت لٹتی ہوئی دیکھی تو انہوں نے احتجاج کیا— ہاورڈ ہیوز نے آر کے او سٹوڈیوز سے اپنے حصص نکلوا لیے — وہ خوب صورت لڑکیوں پر بھاری رقمیں خرچ کر کے انہیں کسی ہوٹل میں خوب صورت اور پر آسائش کمرے دلوا دیتا اور حکم دیتا کہ وہ چوبیس گھنٹے اس کی آمد کا انتظار کرے اور یہ بھول جاتا کہ کوئی لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے — ایک خاتون کے ساتھ اس نے بڑی مشکل اور بڑی رقم

سے معاملہ طے کیا اور جب قربت کا وقت آیا اور وہ لباس بھی اتار چکی تو ہاورڈ ہیوز اس کے پاس نہ گیا، کیونکہ وہ ہوا بازی کے ایک رسالے کو پڑھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

اسی طرح اس کا ایک سیکرٹری بتاتا ہے کہ ایک فرانسیسی رقاصہ کے حصول کے لیے وہ ایک سال تک جدوجہد کرتا رہا۔ اس رقاصہ کے عملے کے بیس افراد کو سال بھر تک اخراجات دیتا رہا، لیکن وہ ایک بار بھی اس کے پاس نہ گیا۔

اس کے ساتھ جن عورتوں کا تعلق رہا، وہ ایک ہی بات بتاتی ہیں کہ وہ بے حد حاسد تھا۔ وہ عورتوں کو قیدی بنا لیتا تھا وہ ان پر دولت نچھاور کرتا تھا۔ مگر یہ برداشت نہ کرتا تھا کہ وہ کسی دوسرے سے مسکرا کر بھی ملیں۔

ایسا پُراسرار دلچسپ اور انوکھا انسان پچھلے دنوں انتقال کر گیا۔

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی رحلت

یہ برس اپنے ساتھ ایسی گہری جدائیوں کو بھی لے کر آیا ہے کہ جدا ہونے والوں کے نقش دلوں سے کبھی محو نہ ہوں گے اور جدائی کے زخم رستے رہیں گے۔ ابراہیم جلیس گئے۔۔۔ ابن انشاء گئے۔۔۔ محمد حسن عسکری گئے اور اب صوفی تبسم بھی رخت سفر باندھ کر راہیِ ملک عدم ہوئے۔

صوفی صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔۔۔ وہ استاد تھے۔ اردو، پنجابی فارسی کے شاعر تھے۔ ادیب اور نقاد تھے۔ بچوں کے شاعر تھے۔۔۔ اقبالیات اور غالبیات پر مسلم حیثیت رکھتے تھے اور پھر یہ کہ ایک بڑے انسان تھے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا، بہت کچھ پڑھایا اور لکھایا اور برصغیر پاک و ہند میں ان کے چاہنے والے شاگردوں کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔

صوفی صاحب نے ان لوگوں کی صحبتیں دیکھی تھیں، جن کے تذکرے ہم سنتے چلے آئے ہیں، صوفی صاحب باقیات الصالحات میں سے تھے اور اب وہ بھی نہیں رہے تو خلا ہی خلا ہے۔۔۔ ایسا خلا جو پُر نہیں ہو سکتا۔ صوفی صاحب نے بھرپور زندگی بسر کی، وہ کبھی بوڑھے نہ ہوئے۔ وہ خوش مزاج اور خوش باش انسان تھے۔ اتنے بڑے ہونے کے باوجود وہ عام انسانوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ دیو سماج روڈ (سنت نگر) پر ان کے بھائی کی ایک دکان ہے۔ خود صوفی صاحب نے بھی اپنی زندگی کا بڑا حصہ وہاں بسر کیا تھا۔ ہم نے صوفی صاحب کو اس دکان پر کئی بار

دیکھا — رنگین سلکی کرتہ پہنے وہ تنور پر جھکے نظر آتے — وہ اپنے شوق کے لیے کلچے لگایا کرتے تھے — دوستوں اور عزیزوں کو کھلاتے — اب دیکھیے، سوچیے تو یہ بات عجیب سی لگتی ہے، لیکن صوفی صاحب عظیم انسان تھے اور انسان کی عظمت کے وہ صرف زبانی کلامی ہی دعویدار نہ تھے بلکہ وہ اپنے اعمال سے بھی ثابت کرتے تھے کہ وہ کسی محنت اور کام میں عار نہیں سمجھتے۔

پروفیسر محمد عثمان نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ وہ دوستوں کے ہاں بھیجے جانے والے کھنڈ کلچوں کی ترتیب پر پریشان تھے اور پھر انہوں نے خود طشتریوں میں کھنڈ کلچوں کی نئے سرے سے ترتیب دی اور پھر مطمئن ہوئے۔

پاکستان ٹی وی سے ان کی یاد میں پروگرام پیش کیا گیا وہ تسلی بخش تھا؛ بہرحال اب وہ شاعر نہیں رہا — جس نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ایسے ترانے لکھے کہ جو زبانِ زدِ عام ہوئے۔ وہ استاد نہیں رہا جس سے ہزاروں انسانوں نے فیض حاصل کیا۔ صوفی صاحب ایک دبستان تھے۔

ریاض جاوید کی باتیں

۔۔ میکلوڈ روڈ پر شان بلڈنگ۔ ویکلی "نماز" کا دفتر۔

چند برس پہلے — وہ آدمی یہیں مجھے پہلی بار ملا، جو پچھلے دنوں اللہ کو پیارا ہو گیا ہے —

اور پھر یوں ہوا کہ ریاض جاوید کے ساتھ میرے دن اور میری راتیں گزرنے لگیں۔ گھنٹوں ہم ایک دوسرے سے گفتگو میں مصروف رہتے — ادب، سیاست، فلم اور جانے کون کون سا موضوع تھا جس پر ہم بے دھڑک گفتگو کیا کرتے تھے —

وہ ایک سچا اور کھرا آدمی تھا — عزلت نشین، لوگوں سے کم ملتا، مجلسوں محفلوں سے گریزاں رہتا تھا —

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے اس کے بارے میں کہا تھا — "وہ لاہور میں اب واحد پاجامہ پوش ادیب ہے" — لیکن جب ریاض جاوید سے میری ملاقات ہوئی تو پاجامہ پتلون میں بدل چکا تھا — صحت جواب دے چکی تھی —

ان دنوں وہ بے کار تھا — جانے کب سے بے کار تھا — "تعمیر" کی نوکری چھوٹی تو بے کاری کا لمبا دور شروع ہوا — اس دوران میں اس سے پہلے وہ پھلواری اور تہذیب میں کام کرتا رہا تھا۔

چند مہینے اس نے اردو ڈائجسٹ میں بھی کام کیا تھا، لیکن وہاں وہ چل نہ سکا تھا
جب میری اس کی ملاقات ہوئی تو وہ پٹھان بلڈنگ کے ایک کمرے میں آکر صبح سویرے
بیٹھ جاتا تھا —

کتابی دنیا کے سلطان احمد ایک وضعدار انسان ہیں — وہ ریاض جاوید کے مونس
ہمدرد تھے اور اس زمانے میں ریاض جاوید کی چائے سگریٹ کے اخراجات وہی برداشت
کرتے تھے — ریاض جاوید نے ایک نئے انداز کا رسالہ نکالنے کا پروگرام بنایا تھا اور
سلطان احمد ہی اس رسالے پر پیسے لگانے والے تھے اور انہوں نے ہی ریاض جاوید
کو یہ کمرہ کرائے پر لے کر دیا تھا — یہ کمرہ بھی ریاض جاوید کو چند مہینوں کے بعد خالی
کرنا پڑا، کیونکہ سلطان احمد کے مالی حالات ابتر ہو رہے تھے — ۱۹۷۱ء کی جنگ
نے حالات بہت مایوس کن کر دیے تھے — پھر ریاض جاوید میرے پاس بیٹھنے لگے۔
کچھ دنوں بعد ریاض جاوید اکتا گئے اور اس نے کہا کہ اس کو بیٹھنے کے لیے
کوئی دوسری جگہ چاہیے کیونکہ اس کی وجہ سے میرے کام میں ہرج ہوتا ہے — ان
دنوں میں بعد دوپہر 'معلومات' کے دفتر اردو بازار (حبیب بنک بلڈنگ) جایا کرتا
تھا — میں نے ریاض جاوید کے وہاں بیٹھنے کا انتظام کر دیا۔ کچھ دنوں وہ نیشنل
بک سنٹر میں بھی آکر بیٹھتا رہا — سید قاسم محمود سے اس کی لمبی بحثیں رہتی تھیں اور پھر
ہم ایک دن اچانک ایک معمولی سے اختلاف پر بگڑ گئے اور میرا اور ریاض جاوید
کا ملنا جلنا ختم ہو گیا —

آج سوچتا ہوں کہ ہم کتنے چھوٹے، خودغرض ہوتے ہیں کہ معمولی باتوں پر بگڑ جاتے
ہیں اور مجھ جیسے انسانوں میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا کہ روٹھے ہوئے دوست کو منالیں۔
اور پھر وقت گزر چکا ہوتا ہے اور ریاض جاوید جیسے روٹھے ہوئے دوستوں کو موت کا
بلاوا آجاتا ہے —

جن دنوں ٹی وی پر اس کی سیریز "اجنبی آنے کے بعد" دکھائی جارہی تھی۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ ایک بار اس سے رابطہ قائم کروں اور اُسے جو کہ خود اپنا بہت بڑا نقاد اور نکتہ چیں تھا، اسے سمجھاؤں کہ ریاض جاوید صاحب ـــ بات بن نہیں رہی اور آپ کا ہدایت کار آپ کی روح کو سمجھ نہیں سکا ـــ اور ریاض جاوید مجھے کہتا : مولانا، تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن چلو کچھ دال روٹی تو چل رہی ہے ـــ

ریاض جاوید ساری عمر ـــ عدم تحفظ کا شکار رہے ـــ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بڑی خدمت کی ـــ وہ اس کے سیکرٹری بھی رہے ـــ کمیونسٹ پارٹی سے بھی اُن کا تعلق رہا ـــ گیٹ میٹنگوں میں شریک ہوتے رہے۔ ریاض جاوید آخری برسوں میں تمام ترقی پسند مصنفوں سے برگشتہ ہو چکا تھا۔ اس کی زبان سے ان کے لیے کبھی اچھا جملہ نہ نکلتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے پنجاب (یا برصغیر میں) کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ پر ایک کتاب بھی لکھی تھی ـــ اس کتاب کا اہم باب ترقی پسند مصنفین کے بارے میں تھا ـــ یہ مسودہ جہاں تک مجھے علم ہے، کتابت ہو گیا تھا۔ "امروز" کے ریکارڈ انچارج اسے چھاپ رہے تھے۔ میں نے اس کا کتابت شدہ مسودہ پڑھا تھا، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ یہ اہم کتاب شائع نہ ہو سکی۔

آج بعض لوگ اس کو "ترقی پسند" ثابت کر رہے ہیں ـــ یقیناً ریاض جاوید ترقی پسند تھا، لیکن وہ نام نہاد ترقی پسندوں سے ہمیشہ نالاں رہا اور اس کی زبان سے ان کے لیے اچھے کلمات کبھی نہ نکلے ـــ ریاض جاوید نے مجھے بزرگ اور نامور ترقی پسندوں کے ایسے ایسے دلگداز واقعات سناتے تھے کہ بعض اوقات میں اس سے اُلجھ پڑتا تھا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے جس پر وہ اکڑ جاتا کہ ـــ چلو میں سب کچھ ثابت کرا دیتا ہوں، لیکن شاید مجھ میں یہ کمزوری ہے کہ میں

بہت سے لوگوں کا جرم ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس لیے میں نے بھی اس کو چیلنج نہ کیا کہ وہ اپنے دعوے کو ثابت کر کے دکھاوے گا۔

ربانی جاوید یعنی معنوی طور پر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ وہ نام نہاد ترقی پسندوں کی طرح فلیپ پڑھ کر ادب پر گفتگو نہ کرتا تھا — اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس کے پاس کئی برسوں کی دنیا کے اہم جریدوں کی مجلد فائلیں تھیں جنہیں وہ بڑا سنبھال کر رکھتا تھا۔ اس کے پاس عالمی ادب کے منتخب فن پارے تھے۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ اس کا مجھ پر بہت احسان ہے۔ اس کا یہ کرم ہے کہ اس کی وساطت سے مجھے فرڈیننڈ سیلنی (CELNI) سے تعارف حاصل ہوا اور میں نے عالمی ادب کا عظیم ترین شاہکار DEATH IN INSTALMENTS پڑھا۔ اس کے علاوہ کتنے ہی فن پارے ہیں جو میں نے اس کے حوالے سے پڑھے۔ ہم نے ان پر گھنٹوں گفتگو کی اور پھر اس گفتگو سے مجھے بہت کچھ حاصل ہوا — وہ مارکسزم پر بڑی گہری نظر رکھتا تھا — حالات حاضرہ پر تجزیہ اس خوب صورتی اور عقلی انداز سے کرتا تھا کہ اس کے نتائج پر اعتماد کرنا پڑتا تھا — وہ بڑے سے بڑے مسئلے کو خالص پنجابی انداز میں ادا کرنے کا بھی ماہر تھا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ ربانی جاوید ہاتھ میں ٹوکری لے کر گھر سے نکلا — سودا سلف لانے کے لیے — اور میرے ہاں آ گیا اور پھر سارا دن وہیں رہا — باتیں، بحثیں۔ شام ہونے لگتی تو وہ کہتا: "مولانا! سارا دن غارت ہو گیا۔ میں گھر سے سودا خریدنے نکلا تھا۔"

وہ خوددار تھا، اس لیے اس کے مزاج میں تنک مزاجی آ گئی تھی۔ ہمارے ساتھ کھانے پر بیٹھتا تو وہ کھانے میں نقص نکالنے لگتا — پہلے تو مجھے برا لگا، لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا — پھر میں سمجھ گیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ وہ اندر

ور یہ تاثر دے رہا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں اور وہ مجبوراً ہمارے ساتھ شریک ہے۔ اس لیے اس کی انا اور خودداری مجروح ہو رہی ہے۔ اس کی خودداری کا یہ بھی عالم تھا کہ اس نے اپنی کئی نادر کتابیں یوں بیچیں کہ وہ پہلے کئی دنوں تک وہ ان کتابوں کے بارے میں مجھ سے گفتگو کرتا رہا۔ میرے اندر تجسس بھڑکاتا کہ میں انہیں پڑھوں۔۔ جب میں دکانوں میں ان کتابوں کی تلاش میں نکلتا اور کتابیں نہ ملتیں تو

پھر وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہتا: "مولانا، میں ہی یہ کتابیں تمہارے لیے کہیں سے ڈھونڈ لاؤں گا۔" اور وہ کتابیں لے آتا۔ اور میں آہستہ آہستہ یہ راز پا گیا کہ دراصل یہ اس کی اپنی کتابیں ہیں، جنہیں وہ ضرورت کے لیے بیچ رہا ہے۔

ریاض جاوید اس لحاظ سے بدقسمت رہا کہ اتنا بڑا ناول نگار ہونے کے باوجود اس کے نام اور کام سے اردو کے "وسیع النظر" نقاد ناواقف ہیں۔

ناول کے فن پر اسے جو دسترس حاصل تھی، اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ عزیز احمد سے کم نہ تھا۔ اس کے ناولوں پر محمد منشا یاد کے علاوہ اور شاید ہی کسی نے ڈھب سے لکھا ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے تینوں ناول "لہو رسنے کے بعد"۔ "زخم کھلنے کے بعد"۔ "اجنبی آنے کے بعد" کا شمار بہترین ناولوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان ناولوں کے بعض حصوں اور بعض کرداروں پر میری ریاض جاوید سے بڑی بحثیں ہوتی رہی ہیں اور مجھے اندازہ ہے کہ اس نے اردو ادب کو کیا کچھ دیا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ریاض جاوید کے ناولوں اور اس کے نام کی ہم صحیح معنوں میں قدر کر سکیں گے اور ان کو قابلِ قدر اثاثہ سمجھیں گے۔

ریاض جاوید "مساوات" میں چلے گئے۔ کچھ روز کام کیا۔ پھر انہیں لقوہ

ہوگیا۔ صاحب فراش رہے اور پھر صحت یاب ہوکر 'نصرت' اور 'مساوات' میں کام کرتے رہے۔ 'نصرت' سے فارغ ہوئے تو پھر 'مساوات' میں اداریہ لکھنے لگے۔ بیماری اور کمزوری کے عالم میں بھی وہ کام کرتے رہے۔ جب تک ہمت رہی، کام سے جی نہ چرایا۔ لیکن وقت آچکا تھا۔ باون برس کی عمر میں وہ شخص دنیا سے اُٹھ گیا، جس کے ادبی کمالات کا اعتراف اس کی زندگی میں کم ہوا۔ لیکن زمانہ منصف ہے اور اس کی عظمت کو ایک نہ ایک دن ضرور تسلیم کیا جائے گا اور بطورِ خاص اس کا نام اردو ادب کے عظیم ناول نگاروں میں شمار ہوگا۔

سید وقار عظیم

سید وقار عظیم بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔

وہ ایک بڑے استاد، بڑے ادیب اور بڑے نقاد تھے اور اس کے علاوہ وہ ایک بڑے انسان تھے ــــ وضعداری نبھانا خوب جانتے تھے۔ دھیمے لہجے کے انسان تھے ــــ ایک خاص وضع قطع تھی ــــ مخصوص لباس پہنتے۔ شیروانی، چھوٹی موری کا پاجامہ اور مفلر گلے میں ہوتا ــــ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ کئی پرچوں کے مدیر رہے ــــ "آج کل" دہلی ــــ "ماہ نو" اور "نقوش"۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے ــــ ہزاروں شاگردوں نے ان سے فیض اٹھایا ــــ اردو ادب میں ان کی سب سے بڑی عطا افسانے پر تنقید ہے ــــ وہ اردو کے ایسے نقاد تھے، جنہوں نے افسانے پر بھرپور کام کیا ہے اور اس حوالے سے وہ اردو تنقید میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ــــ

مجھے وہ دن یاد ہے، جب انہوں نے بڑے میٹھے لہجے میں مجھے ایک اہم سبق پڑھایا تھا ــــ ان دنوں میں نیشنل بک سنٹر میں ملازم تھا ــــ آئے دن وہاں نئی کتابوں کی افتتاحی تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ ایک نئے لکھنے والے کے ایک ناول کے سلسلے میں بھی ایک تقریب کا انعقاد ہوا ــــ اتفاق سے اس ناول کی میں نے ہی نظر ثانی کی تھی اور اس کا دیباچہ بھی میں نے ہی لکھا تھا۔ ہمارے

ہاں ایک عام رواج ہے کہ دیباچہ نگار کتاب اور صاحبِ کتاب کی تعریف میں خاصے مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اس کا منصب کتاب کی کمزوریوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنا نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کے محاسن کو اجاگر کرنے کا فرض اس کے ذمے سونپا جاتا ہے جس سے لکھنے والا یقیناً عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس ناول کے دیباچے میں میں نے ایک جملہ کچھ اس قسم کا بھی لکھ دیا تھا کہ "مکمل ترین ناول" ہے۔ سید وقار عظیم صاحب بھی اس کتاب کی تقریب میں مضمون پڑھنے تشریف لائے تھے۔ تقریب سے پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر وہ اچانک مجھے ایک طرف لے گئے اور بڑے میٹھے لہجے میں سمجھانے لگے کہ فن میں کوئی چیز مکمل نہیں ہوتی۔۔۔ یہ ناول بلاشبہ بہت اچھا ناول ہے۔ خود میں بھی اپنے اس مضمون میں ناول کو سراہ رہا ہوں۔ یہ ہے ہی تعریف کے قابل۔ لیکن "مکمل ترین" نہیں ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے میرے ساتھ چند منٹ کی گفتگو کی۔ جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور مطالعۂ ادب میں میں نے محتاط نقطۂ نظر اپنا لیا۔

سید وقار عظیم کی وفات بلاشبہ اردو ادب کا بڑا نقصان ہے اور یہ روایتی جملہ نہیں ہے۔

خواجہ ابتسام احمد

صحافت کی دنیا کا ایک خابش، ممتاز اور شریف النفس فرد اللہ کو پیارا ہوگیا۔ خواجہ ابتسام احمد مارننگ نیوز کے ایڈیٹر تھے، جن کا انتقال چند روز پہلے کراچی میں ہوا۔ خواجہ ابتسام احمد اس ملک کے سر برآوردہ صحافیوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے بی۔اے ایل ایل بی کا امتحان انگلینڈ سے پاس کیا تھا۔ پاکستان میں آئے تو انہوں نے محکمہ پولیس کی ملازمت کرلی۔ محکمہ پولیس میں وہ ایک بڑے عہدیدار تھے۔ لیکن ان کی شریف النفسی نے گوارا نہ کیا کہ وہ اس محکمے میں کام کریں جہاں انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا اور خود انسان کا اپنا ضمیر دا غدار ہو جاتا ہے خواجہ ابتسام احمد اس اعتبار سے بھی عظیم ٹھہرے کہ انہوں نے پولیس کے اعلیٰ عہدے کو ٹھکرا کر استعفیٰ دے دیا اور پھر صحافت میں چلے آئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ سب ایڈیٹر کی حیثیت سے پاکستان سٹینڈرڈ میں آئے۔۔ یہاں تنخواہ پولیس کے عہدے کے مقابلے میں کم تھی، لیکن وہ بے حد مطمئن تھے۔ کیونکہ وہ اس شعبے میں آگئے تھے جو حق وانصاف اور علم وخبر کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ خواجہ ابتسام احمد نے اس کے بعد انگریزی کے کئی سر برآوردہ اخباروں میں ملازمت کی اور پھر ۱۹۶۴ء میں مورننگ نیوز میں چلے آئے اور صحافت کی خدمت کرتے ہوتے

وہ نیوز ایڈیٹر بنے اور وفات پائی۔

وہ ایک بڑے صحافی تھے، جن کی وفات سے نہ صرف ایک خاندان ان کے لواحقین کو گہرا صدمہ پہنچا ہے بلکہ ملکی صحافت کو بھی گہرا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ ان کے قریبی ساتھی اور احباب جانتے ہیں کہ وہ انگریزی کے صحافی ہونے کے باوجود اردو سے محبت کرتے تھے اور اردو میں ہی گفتگو اور خط و کتابت کو ترجیح دیتے تھے۔

پال رابسن

پال رابسن بھی چل بسے —
کھلاڑی، سٹیج ایکٹر — فلم ایکٹر — گویا حبشی پال رابسن بھی چل بسے۔ انہوں نے امریکہ میں کالے رنگ کی عظمت کو نکھارا — اپنے فن سے سیاہ فاموں کو سفید فاموں سے برتر ثابت کیا اور جب سفید فاموں نے ان پر رزق کے دروازے بند کر دیے تو بھی آزاد خیالی اور حق و انصاف کی تحریک سے دستبردار نہ ہوئے۔ وہ ایک مفرور حبشی غلام کے بیٹے تھے اور جانتے تھے کہ سفید فام امریکہ میں کالوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے — انہوں نے پہلا ریکارڈ تو یہ توڑا کہ فٹ بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے سفید فاموں پر برتری حاصل کی اور پوری ٹیم میں واحد سیاہ فام تھے — انہوں نے اس کے بعد وکالت کا امتحان پاس کیا — کچھ عرصہ وکالت کی، پھر اداکاری کی دنیا میں آئے — یوجین اونیل جیسے عظیم ڈراما نگار نے ان کو اپنے شہرۂ آفاق ڈراموں میں مرکزی کردار دیے جن میں "ایمپرر جونز" خاص طور پر مشہور ہے۔ "شو بوٹ" میں ان کا گایا ہوا گیت OL MAN RIVER سپر ہٹ ثابت ہوا، اور بطور گلوکار وہ عظیم فن کار تسلیم کیے گئے — انہوں نے کچھ فلموں میں اپنی بے مثال اداکاری کے جوہر دکھائے اور ایک بار پھر پورے امریکہ کو چونکا دیا — ۱۹۴۳ء میں جب وہ اوتھیلو کے کردار میں سٹیج پر آئے تو ان کی عظمتوں

کا لوہا ماننا پڑا — یہ پہلا موقعہ تھا کہ امریکہ کی کسی سٹیج پر کسی سیاہ فام نے کسی سفید فام اداکارہ کا بوسہ لیا تھا — شکسپیئر کا یہ عظیم کھیل براڈوے میں ۲۹۵ راتیں کھیلا گیا — جو ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے —

پال رابسن، باضمیر انسان تھے — وہ سفید فاموں کے جبر و تشدد اور رویے کے خلاف احتجاج کرتے رہتے تھے۔ ان کی آزاد خیالی کی وجہ سے ان کو میکارتھی ازم کا شکار ہونا پڑا — ان پر رزق کے دروازے بند کر دیے گئے — ۱۹۴۷ء میں وہ ایک طرح سے قلاش ہو گئے تھے اور پھر وہ ایک طرح سے دنیا سے کٹ کر خاموشی سے زندگی بسر کرتے رہے — پچھلے دنوں ،، برس کی عمر میں اس عظیم اداکار، گلوکار اور مرد حق کا انتقال ہو گیا —

جاں نثار اختر

وہ لوگ جنہوں نے ادب کی ترقی پسند مصنفین کی تحریک کا مطالعہ کیا ہے یا پچھلی دو چار دہائیوں میں لکھی جانے والی شاعری کو پڑھا ہے ــ وہ جاں نثار اختر سے اچھی طرح واقف ہوں گے ــ اس کے علاوہ جن لوگوں کو اچھے فلمی گیت سننے کا ذوق ہے وہ بھی جاں نثار اختر کو گیتوں کے حوالے سے جانتے ہوں گے۔ جاں نثار اختر نے بعض خوبصورت گیت لکھے ہیں، ایسے گیت جن پر فلمی گیتوں کی تہمت باندھنے کو جی نہیں چاہتا ــ جس روز ان کے انتقال کی خبر پڑھی، اس سے اگلے روز ان کا ــــــ ایک بے حد خوبصورت گیت سنا تو جاں نثار اختر بُری طرح یاد آئے ــ آپ نے بھی وہ گیت سنا ہو گا جسے لتا نے گایا ہے اور جسے دلو نے جس کی دُھن تیار کی ہے :

ے یہ دل اور ان کی نگاہوں کے سائے

اس گیت میں جاں نثار اختر نے حسن فطرت اور محبت کے بندھنوں کو جس خوبصورتی سے باندھا ہے اس کی وجہ سے یہ گیت کبھی نہ مرے گا۔ اس گیت میں جاں نثار اختر نے یہ خوب صورت مصرع بھی لکھا تھا :

ہوا ہر ندی کا بدن چومتی ہے

جاں نثار اختر ترقی پسند مصنفین کے ایک مثالی رکن تھے — انہوں نے شعر کہے — آزادی کے حصول اور غربت کے خاتمے کے لیے کام کیا — وہ اپنے نظریات میں بڑے راسخ تھے اور اپنے نظریات کی وجہ سے جاں نثار اختر کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں — جاں نثار اختر نے ایک اچھے شاعر اور ترقی پسند کارکن کے علاوہ ایک اور حوالے سے بھی بڑی شہرت پائی۔ صفیہ کے شوہر کی حیثیت سے — صفیہ، جو صفیہ جاں نثار اختر کے نام سے پہچانی جاتی ہے — صفیہ جو اردو کے ایک اچھے شاعر، اسرار الحق مجاز کی ہمشیرہ تھیں۔ صفیہ جاں نثار اختر نے جاں نثار اختر کے نام جو خطوط لکھے ہیں، وہ اردو ادب کا ایک بیش بہا سرمایہ ہیں — ان دنوں جاں نثار اختر "سرکاری مہمان" یعنی جیل میں تھے — کہ جب صفیہ نے انہیں یہ خطوط لکھے — یہ خطوط ایک عظیم عورت اور چاہنے والی بیوی اور ساتھی کے جذبات کی بے مثل عکاسی کرتے ہیں — اس حقیقت میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ صفیہ جاں نثار اختر ایک عظیم خاتون ہیں۔ — کرشن چندر نے صفیہ جاں نثار اختر کے خطوط کا جو دیباچہ لکھا تھا، وہ اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت کی تحریر ہے —

صفیہ کا انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ آزادی کے بعد جاں نثار اختر نے فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کی ٹھانی — انہوں نے بعض فلموں میں گیت لکھے اور سچ تو یہ ہے کہ خوب لکھے — ایک فلم بھی پروڈیوس کی جو زیادہ کامیاب نہ ہوئی — جاں نثار اختر کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ایک زمانے میں ان کی ایک نظم بڑی مشہور تھی —

کون سا گیت سنو گی انجم

اب بھی اگر جاں نثار اختر کی تخلیقات کا کڑا انتخاب کیا جائے تو ان

کے کلام میں اتنی جان ہے کہ اس میں بہت سی ایسی نظمیں، غزلیں بھی مل جائیں گی، جن میں انفرادیت ہے — جو ہمیشہ صاحبِ ذوق قارئین کو متاثر کرتی رہیں گی — جاں نثار اختر نے فلموں کے لیے گیت لکھے تھے — وہ ان کا ایک اور بڑا کنٹری بیوشن تھا —

قاضی نذرالاسلام

قاضی نذرالاسلام بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

قاضی نذرالاسلام کی وفات پر بنگلہ دیش میں سرکاری اور عوامی سطح پر جس طرح سوگ منایا گیا ـــ وہ ایک ایسی روایت کا آغاز ہے جسے ہر آزاد ملک کو اپنانا چاہیے۔ ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی صدر صائم چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور آرمی کے چیف آف سٹاف فوراً ہسپتال پہنچے ـــ گہرے رنج و غم اور سوگ کا اظہار کیا اور قاضی نذرالاسلام کے جنازے میں لاکھوں انسانوں کے ساتھ شرکت کی۔

بنگالی شعر و ادب میں قاضی نذرالاسلام کا جو مقام ہے انہوں نے بنگالی شعر و ادب کو جس طرح اپنی بے پناہ خلاقی سے متاثر کیا، وہ اپنی جگہ ایک لازوال اضافہ اور قاضی نذرالسلام کی بیش بہا عطا ہے۔

ایک عرصہ تک ایسا ہوا اور اب بھی ایک طبقہ خیال ایسا ہے کہ جو ٹیگور اور قاضی نذرالسلام کے درمیان موازنہ کرتا رہا: حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قاضی نذرالسلام کی عظیم شعری صلاحیتوں اور انفرادیت کا اعتراف ٹیگور نے خود اپنی زندگی میں کیا تھا۔ ٹیگور کو بعض سیاسی وجوہات اور بالخصوص ہندو ذہنیت رکھنے والوں اور ہندوؤں نے ہمیشہ قاضی نذرالسلام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کی ـــ ٹیگور کو بنگال کا

قومی شاعر قرار دیا گیا — اور تو اور خود مرحوم مشرقی پاکستان میں بھی قاضی نذرالسلام کو نظر انداز کیا جاتا رہا — اور ان کی جگہ ٹیگور کی تصویریں گھروں اور دفتروں میں بڑے احترام سے سجائی جاتی تھیں۔

ٹیگور کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کو ویدانت کا کچھ چسکا تھا۔ ان کی شاعری پڑھیے تو سوئی ہوئی ندی کے خرام کا احساس ہوتا ہے — اس کے برعکس قاضی نذرالسلام کی شاعری بپھرے ہوئے سمندر کی طرح ہے۔ قاضی نذرالسلام نے بنگالی شاعری کے سوئے ہوئے بند پانی میں وہ پتھر پھینکا تھا کہ جس سے سوتے ہوئے پانی میں تلاطم پیدا ہوگیا —

ٹیگور کو انسانیت کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ٹیگور بلاشبہ بے پناہ شاعر تھا۔ ان کا شمار دنیا کے چند بڑے اور صاحب طرز اور منفرد شعرا میں ہوتا ہے، لیکن اسے کیا کہیے کہ ٹیگور اپنی تمام تر انسان دوستی کے باوجود اپنی مخصوص ہندو ذہنیت سے عمر بھر چھٹکارا حاصل نہ کر سکے —

ہندوؤں کی مخصوص ذہنیت کی وجہ سے بھی ٹیگور کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ اور انہیں نوبل انعام دیا گیا — (حالانکہ علامہ اقبال صحیح معنوں میں حقدار تھے) انگریزی میں ٹیگور کے بڑی تعداد میں تراجم ہوئے — اور تو اور ڈبلیو بی ئیٹس (YEATS) نے بھی تراجم کیے —

اس کے باوجود قاضی نذرالسلام کے شعری مرتبے کو کم نہ کیا جا سکا۔ انہوں نے بنگالی ادب میں انقلاب، بیداری اور جدوجہد کا جو نعرہ سب سے پہلے لگایا تھا، اس کی حقیقت کم نہ ہوئی اور نہ کبھی ہو سکتی ہے —

میرے جیسے لوگوں نے انہیں اردو تراجم کے ذریعے پڑھا ہے جناب انتخاب حسین

رائے پوری نے اس سلسلے میں جو کام کیا، وہ بڑا اہم ہے؛ تاہم ضرورت ہے کہ قاضی نذرالاسلام کی تصانیف کا اردو میں ترجمہ ہو — ابھی ان کی کتنی ہی تصانیف ہیں جو اردو میں منتقل نہیں ہوئیں —

قاضی نذرالاسلام پچھلے تیس برسوں سے علیل چلے آرہے تھے، کلکتہ میں مقیم تھے — آزادی کے بعد حکومت پاکستان نے انہیں علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ بھی بھیجا تھا، لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا — تب سے وہ ۱۹۷۲ء تک کلکتہ میں ہی رہے۔ ۱۹۷۲ء میں انہیں بنگلہ دیش لایا گیا اور انہیں ملک کا سب سے بڑا ادبی اعزاز دیا گیا —

قاضی نذرالاسلام جنہوں نے اپنی نظم "باغی کا گیت" سے آگ لگا دی تھی جو کہ حریت پسند نوجوانوں میں یکدم مقبول ہوئے تھے اور جنہوں نے کتنی ہی ایسی نظمیں لکھیں جنہوں نے بنگالی شاعری کا رخ بدل دیا — جنہوں نے انگریز حکومت کے دوران جیل بھی کاٹی تھی — اس شعلہ نوا شاعر کی زبان ۱۹۶۰ء سے بند ہو گئی تھی۔

ذرا تصور کیجیے، وہ پچھلے ۳۶ برس سے بولنے سے معذور تھے — میں نہیں جانتا، اس معذوری نے ان پر کیا کیا ستم ڈھائے ہوں گے۔ شاعر کا حساس دل کتنے شدید کرب سے گزرتا ہوگا —

۳۶ برس تک خاموش رہنے والا انقلابی شاعر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے۔

مکیش

چند روز پہلے ستمبر کے شمع دہلی میں میں نے مکیش کے بیٹے کا خط پڑھا تھا
جس میں اس نے لکھا تھا کہ اس کے والد شمع والوں کے شکر گزار ہیں کہ ان کی
سالگرہ پر شمع کے حوالے سے بہت سے پروانوں کے خطوط آئے اور چونکہ مکیش
لتا منگیشکر اور دوسرے گانے والوں کے ساتھ امریکہ جا رہے ہیں۔ اس لیے وہ
مصروفیت کی وجہ سے شکریے کا خط خود نہیں لکھ سکے۔ اس لیے ان کی ہدایت
میں ان کے بیٹے نے شمع کو خط لکھا۔

چند دنوں بعد خبر آئی کہ مکیش کا امریکہ میں ہارٹ اٹیک کی وجہ سے انتقال
ہوگیا اور ان کی عمر ۵۳ برس بتائی جاتی ہے اور وہ پچھلے تیس پینتیس سالوں سے
بھارتی فلموں کے لیے گانے گا رہے تھے۔ مکیش کی آواز میں کھردرے پن
کے علاوہ ایک ایسا سوز تھا جس نے ہر سننے والے کو متاثر کیا ہے۔ بلاشبہ
وہ بہت بڑے گلوکار تھے۔ ان کے گائے ہوئے سینکڑوں گیت ہر دور میں مقبول
ہوئے ہیں اور ہمیشہ مقبول رہیں گے۔ انہوں نے برصغیر کے ہر بڑے موسیقار
(نوشاد شنکر جے کشن وغیرہ) کی ترتیب دی ہوئی سینکڑوں دھنوں کو گایا تھا۔

ان کے گائے ہوئے گیت بالخصوص دلیپ کمار اور راج کپور پر سب سے
زیادہ پکچرائز ہوئے۔ چند برس پہلے ان پر ایسا دور آیا کہ ان سے بہت کم

گیت گوائے جاتے تھے اور ایک طرح سے انہیں نظر انداز کیا جاتا رہا، لیکن وہ اس بحران سے کامیابی سے نکل آئے اور اب وہ پھر فلموں میں گیت گا رہے تھے ۔ حال ہی میں ساحر لدھیانوی کا لکھا ہوا اور خیام کا ترتیب دیا ہوا فلم "کبھی کبھی" کا ایک گانا جو مکیش نے گایا تھا، بڑا مقبول ہو رہا ہے ۔

"کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے"

موت تو سب کے لیے ہے لیکن ایسے فن کار کی موت پوری دنیا کا نقصان ہے ۔ ادھر بھارت میں گلوکاروں پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہاں سب گانے والے ادھیڑ عمر سے اوپر ہو چکے ہیں ۔ لتا، رفیع، کشور کمار، منا ڈے وغیرہ بھی پچاس سے اوپر ہو چکے ہیں اور وہاں نئے گانے والوں کی خاصی کمی ہے۔ اس خاص صورت حال نے مکیش کی موت سے واقعی ایک بڑا خلا پیدا کر دیا ہے ۔

شورش کاشمیری

جب فون پر ان کی گفتگو سُنی تو وہم گمان تک نہ تھا کہ پھر یہ آواز کبھی سننے کو نہ ملے گی —

آغاجی نے اپنے انتقال سے ایک ڈیڑھ ہفتہ پہلے مجھے فون کیا — آواز جانی پہچانی تھی، لہجہ بھی — لیکن چند لمحوں تک میں اندازہ نہ لگا سکا کہ کس کا فون ہے — آغاجی کہہ رہے تھے :

"جان ! کیا حال ہے ؟"

میں نے پوچھا : "کون صاحب ہیں ؟"

جواب ملا : "جان ! شورش بول رہا ہوں —"

میں نے اُن کی خیریت دریافت کی اور پھر انہوں نے ایک کاتب کا نام لے کر پوچھا :

"جان ! اسے جانتے ہو ؟"

میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو بتایا کہ کوئی کاتب ان کی نئی کتاب کا مسودہ لے کر [illegible] پتہ ہو گیا ہے — میں نے افسوس کا اظہار کیا تو کہنے لگے :

[illegible] پولیس میں رپورٹ کرا دی ہے — [illegible] اور [illegible] چند باتیں اور ہوئیں [illegible]

[illegible] گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوا — [illegible] آدھ [illegible] کے بعد [illegible]

کے اس گزشتہ مسودے کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی صاحب کا کالم پڑھا۔ ناموں کی
مشابہت کی وجہ سے مشہور خطاط اور منصور اسلم کی ان کے ساتھ الجھوٹی ہوگئی تھی۔

[illegible] میں صبح آغا جی کے انتقال کی خبر پڑھی۔

پندرہ سولہ برس ہوتے ہیں جب میں پہلی بار آغا جی سے ملنے "چٹان" کے دفتر
گیا۔ اس سے پہلے میں ان کی تحریریں دیکھ چکا تھا اور ان کی مشہور کتاب "اس بازار میں"
کا [illegible] چکا تھا۔ ان دنوں میں لکھنے پڑھنے کی دنیا میں بالکل نووارد تھا اور میں
"[illegible]" کے [illegible] سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ان کا ایڈریس معلوم نہ تھا
اس لیے ایڈریس لینے کے لیے آغا جی سے ملنے چل دیا۔ سچ پوچھیے تو آغا جی مجھے مطلق
اچھے نہ لگے۔ ان کا رویہ خاصا درشت تھا: بہرحال انہوں نے مجھے سالک صاحب
کا پتا دے دیا۔ اس کے بعد میں آغا جی سے دور ہی رہا۔ جلسوں میں ان کی تقریریں
سن کر، چٹان میں ان کے اداریے اور نظمیں پڑھ کر اور پھر ان کی مختلف لوگوں سے
جنگوں کی تفصیلات سن کر ان کی ذات کی عظمت کا احساس دل میں بڑھتا گیا، لیکن
وہ جو ان کی شخصیت کے بارے میں ذہن پر ایک نقش ثبت ہوگیا تھا اس میں کوئی
تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

جب ممتاز کے نئے دور کا آغاز ہوا اور اس کا دفتر چٹان بلڈنگ میں بنایا گیا
تو پھر میرا وہاں روزانہ آنا جانا شروع ہوا اور پھر ایک زمانہ یہ بھی آیا کہ میں چٹان بلڈنگ
میں آغا جی کے کرائے دار کی حیثیت سے ڈیڑھ دو برس رہا۔ تب آغا جی کی پہلی
رکھائی کا نقش دل سے خود بخود دھل گیا اور آغا صاحب کی دلچسپ اور باغ و بہار شخصیت
نے مجھے مسحور کر دیا۔ ان کی بعض باتوں پر ہنسی بھی آیا کرتی تھی۔ کیونکہ جب انہوں نے
اسی عمارت میں تھنکرز ریستوران کھولا تو ہمارا خیال تھا کہ آغا جی جلد بازی کر رہے ہیں۔ یہ
ہوٹل وغیرہ چلانا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ اور مزاج کے آدمی ہیں اور اس

میں وہ کوئی تجربہ نہیں رکھتے، اس لیے نقصان اٹھائیں گے اور بالآخر ایسا ہی ہوا اور آغا صاحب کو تھنکرز ریستوران، جس پر انہوں نے ہزاروں روپے خرچ کیے تھے، بند کرنا پڑا۔ ان دنوں میں جب تھنکرز ریستوران شٹم پشٹم چل رہا تھا، بڑے مزے کے بیٹھے ہوتے تھے۔ ہم کسی کام سے نیچے آتے تو دیکھتے کہ کھانے سے بھرے ہوئے خوان ہوٹل کے کچن سے آغا صاحب کے دفتر میں قطار اندر قطار چلے جا رہے ہیں۔ پتا چلتا کہ آغا جی کے مہمان آئے ہیں۔ اس لیے ان کی تواضع ہو رہی ہے۔ یوں ریستوران فائدہ میں تو کیا جاتا، الٹا نقصان ہونے لگا۔ آغا صاحب کے مہمانوں کی تعداد ان دنوں خاصی بڑھ گئی تھی اور آغا صاحب ان کی تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ اس لیے ہوتا یوں کہ ریستوران میں جو مزے کی چیز پکتی اس کا بیشتر حصہ تو مہمانوں کی نذر ہو جاتا اور تھوڑا بہت گاہکوں تک پہنچتا۔ لیکن اس میں فائدہ نہ ہو سکتا تھا۔

آغا جی کے ہاں میں نے اس ملک کے بڑے بڑے لوگوں کو دیکھا۔ ان میں ڈاکٹر مبشر حسن بھی تھے اور جوش ملیح آبادی بھی۔ جن کے بارے میں آغا جی طنزیہ نظمیں لکھتے اور چٹان میں چھاپتے رہتے تھے۔ علماء، سیاسی رہنما، شاعر، ادیب، صحافی، سیاسی کارکن، عام ضرورت مند ہر طرح کے لوگ آغا جی کے ہاں آتے تھے۔ کوئی دن ایسا جاتا تھا جب کوئی اہم آدمی ان سے ملاقات کے لیے نہ آیا ہو۔ آغا جی سب سے ملتے، سب کی سنتے اور بساط بھر کام کرتے۔ ان کا لہجہ کھلا ڈھلا ہوتا۔ کھلی ڈھلی پنجابی میں وہ گفتگو کرتے، اپنی ناراضگی اور نفرت کا اظہار بھی خاص پنجابی انداز میں۔ کیا کرتے تھے۔ ان کی محبت اور نفرت، دونوں انتہا پسندی کی حامل تھیں۔ جس سے دوستی ہے، اس کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے اور جس سے نفرت یا دشمنی ہے اسے دھنک کر رکھ دیتے تھے۔ "چٹان" کی فائلوں میں آغا جی کی ہزاروں لکھی ہوئی نثری اور شعری تحریریں ان کے اس رویے کی نشاندہی کرتی ہیں۔

آغاجی — اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ انہوں نے تاریخ کا وہ دور دیکھا
جو اکابرین کا دور تھا — آغاجی نے اپنے دور کے اکابرین سے فائدہ اٹھایا اور پھر ان
اکابرین کی عظیم روایت کو آگے بڑھا کر ان کے ورثے میں بے پناہ اضافہ بھی کیا —
آغاجی علامہ اقبال کے عاشق تھے — انہوں نے مولانا ظفر علی خان، ابوالکلام آزاد اور
عطاء اللہ شاہ بخاری کو صرف دیکھا ہی نہ تھا بلکہ مدتوں ان کی رفاقت میں رہے تھے۔
آغاجی نے ان اکابرین سے جرأت و مردانگی اور اظہار کی بے باکی جیسی چیزیں پائی تھیں۔
کچھ ان کی اپنی طبیعت بھی جرأت مندی کے عناصر سے لبریز تھی — کچھ ان اکابرین کی
محبت اور رفاقت — جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا — وہ جو حق سمجھتے تھے۔
جسے صحیح گردانتے تھے — اس کے لیے تمام صعوبتیں سہنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔
آغاجی نے اپنی عمر عزیز کا ایک طویل عرصہ فرنگیوں اور اپنوں کی قید میں گزارا۔ ان پر ظلم و ستم
کی انتہا کر دی گئی، لیکن وہ مسلک حق سے نہ ہٹے —

آغاجی نے نظم و نثر میں ایک خاص اسلوب پیدا کیا — وہ صاحب طرز نثر نگار
اور شاعر تھے۔ ان کے ہاں ہزل و غزل، طنز و ہجو اور قصیدہ عجیب امتزاج کے ساتھ سامنے
آتا ہے، انہوں نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا — نئی ترکیبیں، نئی اصطلاحیں، ان
کی نثر کا انداز بھی منفرد اور یکتا تھا۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی
خان کی روایت کو آگے بڑھایا — لفظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔
میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ ایک ہی نشست میں چٹان کے لیے سارا مواد
لکھ رہے ہیں۔ نظم بھی، نثر بھی — اداریہ بھی، مضامین بھی — ان پر ہر لمحہ آمد ہوتی رہتی
تھی — وہ INSPIRED SOUL تھے۔ جب چاہتے، جس موضوع پر چاہتے، بلا
تامل لکھنے بیٹھ جاتے تھے نظم و نثر ان کے لیے یکساں آسان تھیں — اردو کے
نقاد ان کے فن اور ان کی تخلیقات پر اس لیے بھی کچھ نہیں لکھ پائے کہ آغاجی ادبی

گروہ بندیوں سے ہمیشہ علیحدہ رہے ــ وہ اپنے مسلک پر چٹان کی طرح ڈٹ جاتے تھے ــ خواہ اس کی راہ میں کوئی بھی آجائے، وہ پروا نہ کرتے تھے ۔

آغاجی ــ اس ملک کے چند باخبر انسانوں میں سے ایک تھے۔ حکومت اور تمام متعلقہ محکموں کے بارے میں ان کے پاس جو اندرونی اور خفیہ اطلاعات پہنچتی تھیں، اس کے SOURCES کا کسی کو علم نہ ہو سکا ــ ایک طرح سے وہ دیوان سنگھ مفتون کی روایت کو بھی آگے بڑھانے والے تھے۔ اس ملک میں چند ہی ایسے صاحبِ قلم ہوئے ہیں، جن کے قلم سے ایوانِ حکومت میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے ــ ہر دور کی حکومت ان سے خائف رہی ۔ چٹان پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کی گئیں۔ ان کے قلم کو خریدنے کی کوشش کی گئی، لیکن آغاجی کبھی نہ بک سکے ــ انہوں نے اپنے دور کے بڑوں کو بھی کبھی اپنے مسلک کے اظہار کی راہ میں کبھی اہمیت نہ دی ــ ان کی زندگی میں ہزاروں ناصح آئے ہوں گے، لیکن انہوں نے کسی کی نہ سُنی، وہی کرتے رہے جو ان کا دل، جو ان کا عقیدہ، جو ان کا ذہن اور شعور چاہتا تھا ــ

آغاجی ــ ایک طرح سے اپنے دَور کے مؤرخ بھی تھے اور تاریخ ساز بھی۔ انہوں نے اپنے دور کی صحیح تاریخ لکھی اور تاریخ بنانے میں بھی حصہ لیا۔ اپنی عمر کے آخری برسوں میں وہ عملی سیاست سے علیحدہ ہو چکے تھے اور اپنے آپ کو آزادیٔ اظہار اور تحفظِ ختم نبوتؐ کے لیے وقف کر چکے تھے اس میدان میں ان کے کارناموں اور ان کی فتوحات کی فہرست بڑی شاندار اور طویل ہے ۔ قید و بند کی صعوبتوں کی وجہ سے برسوں سے ان کی صحت خراب ہو چکی تھی ۔ ذیابطیس ان کے لیے روگ بن چکا تھا، لیکن وہ ہر دم چاق و چوبند رہے ــ وہ بھرپور زندگی گزارتے رہے ــ آزادی اور آزادیٔ گفتار کی جنگ کا یہ پا بی ــ دنیا کے اس

کارزار میں اس بے دریغی سے لڑتا رہا کہ وہ اپنی اولاد کے فرائض کو بھی بھول گئے۔ انہیں اپنے بچوں سے بے حد محبت تھی — وہ ان کے لیے سب کچھ کرنا چاہتے تھے، لیکن عمر کا بڑا حصّہ سیاسی سرگرمیوں اور قید و بند میں گزر گیا — انہوں نے اولاد کی محبت کو بھی اپنے مسلک اور اپنی طویل جدوجہد کے سامنے نثار کر دیا تھا۔

آغا جی جو منہ پھٹ تھے جو بلا جھجک ہر بات کہہ جاتے تھے۔ جنہوں نے اپنے سیاسی حریفوں کے عجیب و غریب نام رکھ چھوڑے تھے جو ایسی چٹکی لیتے تھے کہ دوسرا کراہتا رہ جاتا — جو ایسی طنز کے ماہر تھے کہ اس کی کاٹ تیز اور کاری ہوتی — وہی آغا جی جب دوسرے موضوعات پر لکھتے تو ان کے ہاں ایک عجیب پاکیزگی اور شائستگی ہوتی تھی — میں ان کی ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اچانک ایک جملہ پڑھ کر رک گیا — ایسا جملہ — پورے اردو ادب میں کسی نے نہیں لکھا۔ ایسی بات کو اس شائستگی، اس کرب کے ساتھ اردو کا کوئی نثر نگار بیان نہیں کر سکا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران میں آغا جی احراری کارکنوں کے ساتھ فسادات سے متاثرہ علاقوں میں جاتے ہیں، اس کی تفصیل لکھتے لکھتے وہ ہمیں ایک گاؤں کے ایک گھر میں لے جاتے ہیں، جہاں مسلمان عورتوں اور مردوں کی لاشیں پڑی ہیں — وہاں آغا جی ایک عورت کو دیکھتے ہیں، جس کے ساتھ درندگی کا سلوک کیا گیا تھا۔ آغا جی کو جو چیز نظر آتی ہے ——— اسے دیکھیے وہ کس خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں، وہ جملہ یہ ہے:

"اس کی حیا پھولی ہوئی تھی۔"

اس ایک جملے نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے — اس ایک جملے نے آغا جی کی قدرتِ بیان کی صلاحیتوں کا برملا اظہار کر دیا تھا — ایک عورت ہے جس کی عصمت کو درندے بار بار لوٹ چکے ہیں — اس کی شرمگاہ تک سوج

گئی ہے۔ اس ظلم اور شقاوت کی منظرکشی کے لیے آغا جی ایک جملہ لکھتے ہیں اور کوزے میں دریا بند کر دیتے ہیں — ایک بار پھر اس جملے کو پڑھیے اور سوچیے کہ اس جملے کو لکھنے والا کتنا عظیم ادیب تھا —

منور ظریف

اختر الایمان نے دعوت دی تھی۔

آؤ کہ جشنِ مرگِ محبت منائیں ہم

اور منور ظریف سے اگر کوئی آج پوچھ سکتا اور وہ بھی اس کا جواب دے سکتا، تو وہ اپنے شگفتہ چہرے اور شگفتہ لہجے میں جواب دیتا۔

جشنِ مرگِ محبت منانا تو ایسی کوئی بڑی بات نہیں — ہم نے تو اپنی موت کا جشن منا کر سب کو دکھا دیا ہے۔

اور جب کہ اپنی موت کا جشن منانے والا — ہم میں نہیں رہا تو یوں لگتا ہے کہ وہ دیوانہ جس کی وجہ سے زندگی میں بہت سی رونقیں تھیں اور جس کی وجہ سے یہ احساس ہوتا تھا کہ ہم بھی زندوں میں شامل ہیں — وہ نہیں رہا تو یوں لگتا ہے، جیسے انسانوں کا یہ جنگل اُداس ہو گیا ہے۔

یہ دَور جس میں ہم رہتے ہیں، یہ جنگل کا دَور ہے — انسان جنگلوں کے درختوں کی طرح اُگے ہوئے ہیں — جنگل کی تہذیب میں ہم سانس لے رہے ہیں — ان درختوں کے سب پھل کڑوے ہیں — نفرتوں، کدورتوں، ضرورتوں اور بے انصافیوں اور مجبوریوں کو ہم نے اپنے سینوں میں جنگل کے درختوں کی طرح اُگا رکھا ہے۔ ہم اپنی اپنی

ذات کے اسیر ہیں — دیکھیں تو دنیا کا پھیلاؤ بہت بڑا ہے — دنیا کی ہر آسائش موجود ہے — سائنس نے بہت ترقی کی — انسان نے اپنی زندگی کو آسودہ اور آرام دہ بنانے کے لیے بہت کچھ کیا — لیکن ان تمام مادی ترقیوں کا حاصل کیا ہے. سوچتے ہوئے درشت چہرے، غصے سے لال بھبوکا چہرے، دانت نکوستے ہوتے چہرے، اور یوں لگتا ہے جیسے ایک ایک چہرے کے پیچھے کوئی خونی درندہ چھپا ہوا ہے — ہم انسان ہونے کے باوجود درندگی کی صفات سے چھلکے پڑے ہیں — ہم اس مسکراہٹ سے محروم ہو چکے ہیں — جو انسان اور حیوان کے درمیان فرق کا احساس دلاتی ہے. ایک روتی بسورتی، غصے سے چیختی اور دھاڑتی ہوئی دنیا میں کبھی کبھی کوئی دیوانہ آنکلتا ہے، وہ بھی ہم میں سے ہوتا ہے. اس کے بھی اپنے دکھ اور اپنے غم ہوتے ہیں، لیکن وہ اپنے غموں، دکھوں اور آنسوؤں کو چھپا لینے پر قادر ہوتا ہے — انسانوں کے اس جنگل میں وہ — بہتر انسان ہوتا ہے — اس میں درندگی اور دوسروں کو پھاڑ کھانے والی عادت کی کمی ہوتی ہے — یہ دیوانہ اپنی دیوانگی سے انسانوں کے اس جنگل میں ایک ایسی ہلچل پیدا کر دیتا ہے کہ بھنائے ہوئے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں — کدورتوں اور نفرتوں کی سیاہیاں اس دیوانے کی کسی ایک حرکت کو دیکھ کر چہروں اور دلوں سے دُھل جاتی ہیں اور روتے بسورتے انسانوں کے حلق سے ایک قہقہہ جنم لیتا ہے — سوکھے اور منجمد ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے —

اور ایسا ہی ایک دیوانہ — منور ظریف تھا — جو مر گیا ہے اور انسانوں کا یہ جنگل اُداس ہو گیا ہے —

ٹریجڈی اور کامیڈی کی بحث بہت پُرانی ہے، ارسطو سے پہلے اور ارسطو کے بعد سے اب تک علماء اس بحث میں اُلجھے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اس دیوانے کو کیا کہیے جس کے آنسوؤں میں قہقہے چھپے ہوئے ہوں اور جس کے قہقہوں میں

آنسو پوشیدہ ہوں۔ وہ زندگی کے ایک ایسے جذبے کو تخلیق کرنے پر قادر ہوتا ہے، جو زندگی کی علامت بنتا ہے۔ آنسوؤں اور قہقہوں میں گندھی ہوئی زندگی — زندگی کا یہ پُراسرار جذبہ ہم میں موجود ہوتا ہے۔ مگر چھپا ہوا، سہما ہوا، سسکتا ہوا ہوتا ہے۔

منور ظریف جیسا دیوانہ آتا ہے اور اس جذبے کو بیدار کرتا ہے اور پھر ہم اس جادوگر کے کرشموں پر حیران رہ جاتے ہیں — منور ظریف جیسا جادوگر — جب چاہتا ہے، ہمیں ہنسا دیتا ہے — جب چاہے ہمیں رُلا دیتا ہے۔

وہ چاہے تو اپنے ایک جملے، اپنی آنکھ کے ایک اشارے سے ہمیں قہقہے لگانے پر مجبور کر دے۔

وہ چاہے تو ہمارے اُداس ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر جائے۔ وہ چاہے تو ہمارے ہنستے ہوئے چہروں کو آنسوؤں سے بھگو دے۔

اور منور ظریف یہی کرتا تھا — اس نے ہمیں بہت ہنسایا — بہت ہنسایا۔ اور پھر بعض فلموں میں اس نے ہمیں بہت رُلایا — لیکن اب وہ اپنی موت کے حوالے سے ہمیں جس طرح رُلا گیا ہے، ایسا کب کسی نے رُلایا ہوگا اور میرے جیسا آدمی تو اب یہ بھی سوچنے لگا ہے کہ کیا ہم اس کی قہقہہ خیز فلمیں دیکھ کر اس طرح قہقہے لگا سکیں گے، جس طرح اس کی زندگی میں اس کی فلمیں دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ کیا اس کی موت کے بعد — اس کی آنے والی اور پرانی فلمیں دیکھ کر ہم وہ قہقہے نہ لگائیں گے جو آنسوؤں میں بھیگے ہوئے ہوں۔

سینما ہالوں میں سکرین — جس پر اس کی تصویر ہمیشہ تھرکتی رہے گی — ہم سے باتیں کرتی رہے گی — اپنے فن کا مظاہرہ کرتی رہے گی — کیا اپنے ساتھ اداسیوں کے سائے بھی لیے نہ آئے گی —

نگارخانوں کے وہ برآمدے، وہ سیٹ، وہ کمرے جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا،

جہاں وہ ہنستا اور ہنساتا تھا۔ کیا اب ان میں کوئی فرق نہ پڑے گا ۔ کیا اینٹوں اور سیمنٹ سے بنی ہوئی دیواریں انسانوں سے زیادہ بے حس ہو سکتی ہیں؟ شاید نہیں ۔۔۔ انسان، انسان کو بھلا دیتا ہے ۔۔ انسان فراموش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے ۔ لیکن در و دیوار بے جان ہوتے ہوئے اُسے کبھی نہ بھلا سکیں گی کیونکہ ان بے جان دیواروں نے اس کی من موہنی گفتگو سُنی تھی۔ اس میں اس کی آواز کسی نہ کسی طرح رچی بسی ہوئی ہے ۔۔

لیکن نہیں ۔۔۔ ہم بھلا دینے کی تمام تر صفات رکھنے کے باوجود منور ظریف کو نہ بھلا سکیں گے ۔ کیونکہ وہ ایک بڑا فن کار تھا ۔۔ ایسا فنکار ۔۔ جو صدیوں کے بعد جنم لیتا ہے جس کا اپنا سٹائل ہوتا ہے جو فن کے لیے نئی زندگی بن کر آتا ہے ۔ ردی سے ردی، بے کار سے بے کار اور فضول سے فضول فلم میں بھی منور ظریف جہاں آیا ہنساتا گیا رُلاتا گیا ۔۔ یہ بات دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ ایک فن کار تھا جو خاموش ہاتھوں سے بھی گفتگو کرنے کا فن جانتا تھا جو حرکات میں ردھم کا شہنشاہ تھا ۔ وہ ایک ایسی خوبصورتی کی طرح تھا جو دلوں پر اپنا نقش چھوڑتی ہے ۔ منور ظریف ۔۔ ایسے فنکاروں کو بھلائے نہیں بھلایا جا سکتا ۔۔ وہ اپنی زندگی میں ہی ایک لیجنڈ بن گیا تھا ۔ ایک عام فلمی کامیڈین سے اس نے ایک بڑے کامیڈین کا مقام حاصل کیا اور سب پر چھا گیا ۔ اس نے ہیرو کے رول ادا کیے ۔۔ اس نے کریکٹر ایکٹنگ کی ۔۔ ان سب کرداروں پر اس کی چھاپ گہری لگی ہوئی دکھائی دیتی تھی ۔ اگر اس کی فن کارانہ صلاحیتوں کا ایمانداری سے جائزہ لیا جائے تو جہاں یہ دکھ ہوتا ہے کہ اس کی بھرپور اور منفرد صلاحیتیں ۔۔ گھسے پٹے کرداروں میں ضائع ہوئیں، وہاں یہ بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ دنیا کے بعض ایسے بڑے بڑے فن کار جن کا شہرہ ایک زمانے سے ہے، وہ ان سے بڑا تھا۔

منور ظریف — چارلی چپلن نہیں تھا، لیکن یقیناً وہ ریڈ سکیلٹن، بوب ہوپ اور ڈینی کے سے بڑا فن کار تھا — وہ ہمسایہ ملک بھارت کے کتنے ہی بڑے فن کاروں سے بڑا فن کار تھا — مزاح کی دنیا میں — مزاحیہ اداکاری میں اس کا شمار — دنیا کے چند بڑے فن کاروں میں کیا جا سکتا ہے —

ہمارے ہاں فن کار کی فن کارانہ صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف بہت کم کیا جاتا ہے اور منور ظریف بھی اسی بے التفاتی کا شکار رہا — لیکن اُسے اس کا کوئی گلہ نہ تھا۔ ہوتا۔ وہ لاکھوں فلم بینوں کا پسندیدہ فن کار تھا — وہ ان میں سے تھا جسے ہر طبقے کے فلم بین پسند کرتے تھے۔ مزدور، کسان اور نچلے طبقے کے لوگ بھی اور درمیانے درجے کے شرفا۔ اور اونچے طبقے کے امرا بھی — وہ سب کی پسند تھا — وہ سب کے لیے قہقہوں کی انمول سوغاتیں لے کر آتا تھا۔ وہ سب کو ہنساتا تھا — اس نے جتنے دکھی لوگوں کو ہنسایا — اس نے جتنے اداس چہروں کو مسکراہٹوں سے نوازا، وہ آج سب اُداس ہیں —

جس وقت میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، وہ منوں مٹی کے نیچے سو رہا ہے — ابدی نیند — لیکن اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہے — اس کی زبان کترنی کی طرح چل رہی ہے اور مجھے وہ سب دن، وہ سب شامیں، وہ سب ملنے اور ملاقاتیں یاد آ رہی ہیں، جن میں ہم کبھی ایک دوسرے کے پاس بیٹھے تھے، جب ایک دوسرے سے گفتگو کی تھی۔

وہ ایک بڑا انسان تھا —

کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر بڑا فن کار یا لکھنے والا بڑا انسان بھی ہوتا ہے۔

منور ظریف بھی ایک بڑا انسان اور بڑا فن کار تھا — وہ جملہ کسنے کا عادی تھا۔ مگر اس دنیا میں جہاں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچی جاتی تھی — جہاں ایک دوسرے

کے خلاف سازشوں کا بازار گرم رہتا تھا — وہاں منور ظریف کسی کے خلاف جوڑ توڑ نہ کرتا تھا۔ وہ سب کا دوست تھا اور کسی کا دشمن نہ تھا — وہ سب کے کام آتا تھا — وہ سب کے لیے اچھے جذبات رکھتا تھا — وہ سازشوں غیبتوں اور لغزتوں سے دُور بھاگتا تھا — اس کے دل میں کسی کے لیے حسد نہ تھا، نہ رشک۔

میں نے اُسے کئی بار پوچھا اور کہا کہ وہ خود فلم سازی کا کام کیوں نہیں شروع کرتا۔ تو وہ اپنے مخصوص ہنستے مسکراتے لہجے میں کہتا :

"یار میں ان جھنجٹوں میں پڑنا نہیں چاہتا — میں صرف اداکار ہوں۔ میں اس طرح سے دوسروں کی دشمنیاں کیوں مول لوں —"

اسے اپنے بھائیوں بھتیجوں، بچوں، والدین سے ہی محبت نہ تھی بلکہ وہ سٹوڈیو کے ہر چھوٹے بڑے فرد کے ساتھ ہنستا کھیلتا رہتا تھا — وہ سکرین پر بھی — کیمرے کے سامنے بھی اور عام زندگی میں بھی سب کو ہنساتا رہتا تھا۔ اپنی آنے والی موت کا شدید احساس لیے ہوئے وہ ہنساتا تھا — وہ جانتا تھا کہ دل کا کام تمام ہو چکا ہے اور کوچ کا نقارہ اب بولا کہ اب بولا — لیکن وہ سب کو ہنسا رہا تھا — جانے اس نے اپنے غموں کو کیسے چھپایا تھا اور کیسے سب میں خوشیاں بانٹ رہا تھا — انسانوں کے اس جنگل میں جہاں چیر پھاڑ کھانے والے درندے بستے ہیں، جہاں دوسروں کو دکھ دے کر انسان خوش ہوتا ہے۔ اس جنگل میں وہ سب کو ہنسا رہا تھا — اور اس کا اپنا دل غموں سے چور تھا —

ہاں، سچا قہقہہ آنسوؤں سے ہی جنم لیتا ہے — میں نہیں جانتا — کوئی بھی نہیں جانتا — کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ جس نے برسوں لوگوں کو ہنسایا، اب کتنا رلا گیا ہے اور اس کی موت پر کون کون نہ رویا ہوگا —

وہ عوام کا فن کار تھا — وہ عوام کے لیے ظرافت کی سوغات لیکر آتا تھا —

ایورنیوسٹوڈیو کے ایک کمرے میں اس نے مجھے قومی کی فلم "مینجی کیتھے ڈاہواں" کا تھیم سانگ خود گا کر سنایا تھا — وہ بہت اچھا گلوکار بھی تھا۔ اُسے یہ فلم اور اس کا یہ کردار بے حد پسند تھا — اس میں اُس نے ایک بوڑھے کا کردار ادا کیا تھا۔ جس کی اولاد اسے دھتکار چکی ہے — اس کردار میں اُس نے شاندار پرفارمنس دی تھی —

ایورنیوسٹوڈیو کے اس کمرے میں ایک اداکارہ بھی تھی — ایک بڑا فلم ساز بھی اور ایک اداکارہ کا باپ بھی — ایک وہ تھا اور ایک میں — اور اس نے گانا سنانا شروع کر دیا :

"میں مینجی کیتھے ڈاہواں"

اب اسے ہمیشہ کے لیے وہ جگہ مل گئی ہے جہاں اس کی قبر بن چکی ہے۔ دوسروں کے دکھوں کو قہقہوں میں بدلنے والا خود مر چکا ہے اور انسانوں کا یہ جنگل اور سب لوگ اداس ہیں اور راہ دیکھتے ہیں کہ کون دیوانہ آتا ہے کہ جو ان کی بے ربط اور بے ترتیب زندگیوں کو قہقہوں کی لڑی میں پرو کر کچھ تسلی کچھ تسکین فراہم کرے گا۔

دیوانہ — منور ظریف مر چکا ہے — انسانوں کا یہ جنگل اداس ہے اور جانے کب تک اداس رہے گا —

مشیر کاظمی

مشیر کاظمی سے اپنا برسوں تعلق رہا ــ ایک دور میں تو ہم ایک ہی علاقے میں رہتے تھے۔ وہ بھی رائل پارک میں تھے اور ہم بھی ــ رائل پارک ایک انوکھی دنیا ہے ــ اس کا اپنا ماحول ہے، اپنی فضا ہے ــ اسی فضا میں اب یاد نہیں آرہا کہ کس نے پہلی بار مشیر کاظمی سے تعارف کرایا تھا ــ چند منٹوں میں ہم گھل مل گئے تھے اور یوں برسوں کے تعلقات کی بنیاد پڑ گئی تھی ــ

مشیر کاظمی بڑے مزے کے آدمی تھے، جب ملتے بانہیں کھول کر ملتے، سینے سے لگاتے تھے اور پھر اپنے تازہ کلام سے بھی نوازتے تھے ــ مرحوم خوش گلو شاعر تھے ــ ان کے ترنم میں بہت جان تھی ــ شعر بھی خوب کہتے تھے ــ ان کی اس عادت سے بعض لوگ چڑتے تھے، لیکن مرحوم مشیر کاظمی میں میں نے جو خاص خوبی اس سلسلے میں پائی، وہ یہ تھی کہ وہ اپنا کلام بڑی انکساری سے سناتے اور مشورہ طلب کرتے تھے۔ کچھ لفظوں کے بارے میں استفسار کرتے ــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار انھوں نے مجھے اور اخلاق احمد دہلوی کو رائل پارک کے چوک میں گھیر لیا صبح کا وقت تھا، مشیر کاظمی نے ایک نئی نظم لکھی تھی ــ وہ چوک میں کھڑے ہو کر لہرا لہرا کر اپنی تازہ نظم سنانے لگے۔ اخلاق احمد دہلوی اہل زبان ہیں۔ ان سے وہ بار بار لفظوں کے استعمال اور بندش کے متعلق انکساری سے سوال پوچھ رہے تھے ــ

موت سے ایک مہینہ پہلے وہ مجھے نوائے وقت کی سیڑھیوں کے قریب ملے تھے انہوں نے مجھے اس روز نہ صرف چائے پلائی بلکہ اپنی نئی نظم سے بھی نوازا

مشیر کاظمی، پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتے تھے اور نورجہاں کی آواز پر فریفتہ تھے۔ نورجہاں سے جانے کس کس نے فیض اٹھایا ہے، لیکن جو انسپریشن مشیر کاظمی کو نورجہاں سے حاصل ہوئی اس کی مثال نہیں ملتی ___ مشیر کاظمی قیدیوں کو پیشی بھگتانے عدالت میں لاتے تو عدالت کے قریب واقع کسی چائے خانے میں بیٹھ کر نورجہاں کی آواز میں اس طرح کھو جاتے کہ سب کچھ بھول جاتے۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ لکھیں اور نورجہاں گائیں ___ انہوں نے ملازمت چھوڑ دی اور فاقہ کشی اختیار کی اور اسی فاقہ کشی کے عالم میں انہوں نے ڈنگا سنگھ بلڈنگ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں وہ گیت لکھے جو آج بھی زندہ ہیں اور ان میں وہ گیت بھی ہے، جس کے بول ہیں:

"ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں
جب سارا عالم سوتا ہے"

مشیر کاظمی سے میں نے بارہا اصرار کیا تھا کہ وہ اپنی خود نوشت لکھیں۔ اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم فلمی دنیا میں وہ جس طرح آئے اس کی روداد تو قلمبند کر ہی دیں... وعدہ کرتے رہتے تھے مگر ان کی مصروفیات اور پیٹ کا ایندھن فراہم کرنے کی مجبوریاں انہیں وعدہ پورا کرنے نہ دیتی تھیں ___

وہ ایک عجیب و غریب منظر تھا ___ جب انہیں پہلی بار نورجہاں کے سامنے بطور شاعر لے جایا گیا، تب ان کا لباس بے حد معمولی اور میلا تھا۔ شیو بڑھا ہوا تھا اور انہیں ایسے کمرے میں بٹھایا گیا تھا، جہاں بہت سارے آئینے لگے ہوئے تھے۔ وہ ان آئینوں میں اپنی خستہ حالی کی تصویر دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے کہ نورجہاں

اپنے مخصوص انداز میں اس آئینہ خانہ میں داخل ہوئیں — یہ اس شخص کی نورجہاں سے پہلی ملاقات تھی، جس کی آواز میں اپنا گیت سُننے کے لیے اُس نے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ خستہ حالی اور فاقہ کشی کو اپنا لیا تھا — نورجہاں نے گیت سنا اور فضلی صاحب سے کہا کہ اسی شاعر سے گیت لکھوائیں، میں انہی کے گیت گاؤں گی۔ اور یوں "دوپٹہ" کے گیت نگار کی حیثیت سے مشیر کاظمی کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو پوری ہوگئی۔ اس کے بعد انہوں نے درجنوں فلموں کے گیت لکھے اور درجنوں گیتوں کو نورجہاں نے گایا۔ مگر مشیر کاظمی کو نورجہاں سے اپنی پہلی ملاقات کبھی نہ بھولی۔

مشیر کاظمی نے بہت کچھ کیا — فلم بنائی، بُری طرح فلاپ ہوئی — اداکاری کی۔ ایک فلم میں جلال الدین خوارزم کا کردار بڑے ٹھاٹھ سے ادا کیا — پھر فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار ادا کر کے اپنا پیٹ پالتے رہے۔ جب "آس" میں ان کا چھوٹا سا کردار بوجوہ کٹ گیا تو وہ بڑے رنجور ہوئے تھے — اور انہوں نے اس کا گلہ بھی کیا تھا — ایک رسالہ نکالا، ان کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے لوگ ہی کھا گئے اور رسالہ بند ہوگیا — مشیر کاظمی نے ترانے لکھے اور شاعر اہل بیعت کی حیثیت سے بھی بڑی شہرت کمائی۔ ایوب خان مرحوم کے ساتھ بھی منسلک رہے اور پھر اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اپنی سیاسی شاعری سے بھی بڑا نام کمایا — حبیب جالب کے بعد وہ دوسرے شاعر تھے جنہوں نے سیاسی شاعری میں بے باکی، طنز اور راست گوئی کی روایت کو موجودہ دور میں آگے بڑھایا۔

ایک زمانے میں وہ شراب پیتے تھے اور بڑی مزے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے — ان کے ایسے کتنے ہی لطیفے اور واقعے مجھے یاد ہیں، لیکن دل نے ان کا ساتھ پہلی بار دینے سے انکار کیا تو وہ شراب سے تائب ہوگئے اور پھر اس کافر کو کبھی منہ نہ لگایا اور یوں یہ بات جگر مراد آبادی کی طرح ثابت کر دی کہ یہ کافر لگی بھی ہو تو منہ سے

چھٹ جایا کرتی ہے۔ وہ دن رات مصروف رہتے۔ روزگار اور کام کی تلاش میں سر گرداں رہتے تھے۔ صحت عرصے سے خراب ہو چکی تھی، لیکن زندگی کی جدوجہد وہ آخری دم تک کرتے رہے اور آج موت نے ان کو ہمیشہ کے لیے زندگی کی جدوجہد سے نجات دلوادی ہے۔

مجھے یاد ہے، ایک بار وہ صبح صبح مجھے رائل پارک میں ملے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں دو برتن ہیں۔ میں نے پوچھا: کیا خرید رہے ہیں۔ کہنے لگے: ایک میں چائے لوں گا، دوسرے میں لسی۔ میں نے ان اٹل چیزوں کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے: آپ کی ایک بھابی کے لیے ناشتے پر چائے چاہیے، دوسری کے لیے لسی۔

اور اب میں سوچتا ہوں کہ وہ ایک اچھا شوہر اور اچھے باپ تھے۔ اُس کے بچوں اور بیوائوں کا پُرسانِ حال کون ہوگا؟

ماں جی کو پرسہ

ماں!

ماں سب کی ماں ہوتی ہے۔ تو ظریف — اور منو ظریف کی ہی ماں نہیں بلکہ ہم سب کی ماں ہے۔ ماں — تو دنیا کی ان سب ماؤں کے کرب، دکھوں اور موت سے زیادہ گہرے غموں کی نمائندگی کرتی ہے۔ جن کے بیٹے ان کی آنکھوں کے سامنے اس دنیا سے اُٹھ گئے —

ماں، جب میں تجھے نومبر ۲۰۰۳ء میں ملا تھا تو میں نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے تمہارے متعلق لکھا تھا:

- ماں، جس کا کوئی وطن نہیں ہوتا، جو صرف ماں ہوتی ہے جو ہر جگہ ہر ملک اور ہر دیس میں اپنی ممتا کی خوشبو سے پہچانی جاتی ہے:

اور آج جب نومبر ۲۰۰۳ء سے مئی ۲۰۰۶ء تک زمانے کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے اور تو ایک نیا زخم کھا چکی ہے، جس کا کوئی مداوا نہیں، جس کا اندمال ممکن نہیں، تو میں سوچتا ہوں — ماں دھرتی کی طرح ہوتی ہے — وہ سب کے قدموں کے نیچے بچھی رہتی ہے۔ وہ سب کا دامن مالا مال کر کے اپنے سینے پر ان گنت زخم، خراشیں اور گھاؤ لیے، ہونٹوں پر چپ کا قفل لگائے خاموش رہتی ہے —

ماں، آج تجھ سے میں بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، بہت سی باتیں — جن

کا میرے پاس کوئی جواب نہیں - تیرے پاس کوئی جواب نہیں، کیونکہ ہم سب مجبور ہیں ــ ہم اس کی مصلحتوں کو مطلق نہیں جانتے، جس کے قبضے میں ہماری جان ہے ــ
ماں، جس گھر سے تیرے تین بیٹوں کے جنازے نکلے۔ اس گھر کے باہر ایک کتبہ لگا ہوا ہے نا ــ اس کتبے پر لکھا ہے:

ظریف منزل،

۱۹۶۸

آج میرا جی چاہتا ہے، ماں ــ میں تجھ سے پوچھوں کہ کیا گھر چار دیواری اور چھتوں، کمروں اور زندگی کی آسائشوں سے ترتیب پاتے ہیں یا افراد سے ......
زمانے کے سب سے بڑے غموں کا زہر پینے والی ماں، دکھوں کے گہرے تجربات اٹھانے والی ماں ــ میں سمجھتا ہوں، گھر چار دیواریوں اور افراد دونوں سے مل کر بنتے ہیں۔ بیٹے پردیس گئے ہوں تو ماؤں کے لیے سجے سجائے گھر سونے ہو جاتے ہیں اور پھر جب بیٹے کی چٹھی آتی ہے کہ وہ واپس آ رہا ہے تو پھر مائیں کس طرح گھروں کو چمکاتی ہیں ــ ایک ایک چیز کا منہ دھوتی ہیں۔ بیٹے کے استقبال کے لیے گھر کو سنوارا جاتا ہے ــ
لیکن ماں ــ جن کے بیٹے کبھی واپس نہ آتے ہوں، ان کی مائیں کیا کرتی ہیں؟ ان کو گھر کیسا لگتا ہے ؟
میں تیرا دکھ سمجھتا ہوں ماں ــ تجھ پر جو بیتی ہوگی اس کو پوری طرح محسوس ہی کر لیا جائے تو انسان موم کی طرح پگھل کر رہ جاتا ہے
ماں تو نے مجھے ایک بار بتایا تھا۔ کبھی تم ایک کمرے والے گھر میں رہتی تھیں ــ تم نے فرش پر دریاں بچھا رکھی تھیں۔ کوئی مہمان آتا تھا تو تم اس کی خدمت اور تواضع کے بعد اسے رات سے پہلے رخصت کر دیتی تھیں۔ تم نے کہا تھا ماں ....
"اتنی جگہ ہی نہیں تھی کہ دوسرے کو گھر میں سلایا جائے۔"

اور آج ماں — تو ایک بڑے گھر میں بستی ہے جس کے کئی کمرے ہیں اور میرے دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یقیناً تو جو ماں ہے، سوچتی ہو گی کہ جب تنگی اور عسرت کے باوجود تو کتنی خوش ہو گی — اس چھوٹے سے کمرے والے تیرے گھر، پیارے گھر کو موت نے ابھی نہ دیکھا تھا — موت نے تیرے گھر میں نقب نہ لگائی تھی۔ تیرے جوان بیٹوں کے لاشے وہاں سے نہ نکلے تھے۔

ماں! آج تو اس گھر میں زندہ رہتے ہوئے کیسی کیسی یادوں میں گھری ہوئی نہ رہتی تھی۔ اور پھر ماں —— تیرے ایک بیٹے — منور ظریف نے بڑی ترقی کی — جب اس نے اصرار کیا کہ کہیں کوٹھی بنواؤ — لیکن تو نے کہا تھا: ساری زندگی شہر میں رہی ہوں، اب شہر سے باہر نہ جاؤں گی اور پھر ماں تو نے خود اس ملاقات میں یہ جگہ بتائی — خود مکان تعمیر کرایا — ایک گھر — پیارا گھر زمین کے سینے پر ابھرا — جس میں ایک عظیم فن کار کے بچے رہتے تھے — جس میں ایک عظیم فن کار رہتا تھا — جوانوں کا [illegible] تھا۔ اور پھر اس گھر میں تو رہتی تھی — فرمانبردار بیٹوں کی ماں — پھر اس گھر سے ایک جنازہ نکلا — ایک بیٹا اللہ کو پیارا ہوا اور پھر جس نے ترقی کر کے یہ گھر بنایا تھا۔ اس کا جنازہ بھی اس گھر سے اٹھ گیا۔

ماں! اس گھر میں یہ مرنے والے تو اب کبھی نہ آئیں گے لیکن تیرے دل میں تیرے بیٹوں نے جو گھر بنایا ہے وہاں وہ ہمیشہ آباد رہیں گے۔ تیرے دل میں سے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گی — وہاں تیرے دل سے اپنے بچوں کے لئے اب بھی لوریاں گونجیں گی — مرنے والے بچوں کے لئے بھی تو مائیں لوریاں گایا کرتی ہیں نا۔

جب تو مجھے ملی تھی تو ماں تو نے کہا تھا: "یہ بڑا کھلا گھر ہے، کمرے کے پیچھے بھی جگہ ہے — پیچھے سے بھی بڑا کھلا ہے — وہ یک لگی ہے"

اور بہت اچھی ماں —— میں نے لکھا تھا: "وہ لوگ، وہ [illegible]

کوٹھیوں اور عالی شان مکانوں میں رہتی ہیں، وہ شاید نہیں جانتی ہیں کہ ہمارے ملک کی عورتوں کے لیے دھریک کیا معنی رکھتی ہے ـــ بکائن کے اس درخت کا ہمارے لوک گیتوں میں کس خوب صورت انداز میں ذکر ہوا ہے ـ ہماری تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں یہ دھریک ـــ بکائن کا درخت کتنی ٹھنڈک اور یادوں کو ساتھ لے کر آتا ہے:

ماں ماں، میں نے یہی لکھا تھا ـــ اب اسی بکائن کے درخت کے سائے میں تو کیسی کیسی باتیں سوچتی ہوگی ـــ تیرے بیٹے کبھی ننھے ننھے ہوں گے۔ پھر انہوں نے قدموں قدموں چلنا سیکھا ہوگا ـــ تو نے انہیں لوریاں دے کر سلایا ہوگا ـــ ان کے آنسوؤں پر آنسو بہائے ہوں گے۔ ان کے ہنسنے پر تو ہنس پڑی ہوگی۔ جب کبھی وہ بیمار پڑے ہوں گے تو تم نے ساری ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی ہوگی ـ تو نے اپنے ان بیٹوں کے لیے کیسے کیسے خواب دیکھے ہوں گے ـــ تو نے ان کے ساتھ اپنی زندگی کے کیسے کیسے ارمان وابستہ کیے ہوں گے اور پھر تیرے بیٹے جوان ہوئے ـــ زندگی کی جد و جہد کی سختیاں جھیلتے اور ناموری حاصل کر کے تیرے سینے کی ٹھنڈک بنے ـــ جب تو ان کی شہرت کا ذکر سنتی ہوگی، تیرا سینہ کتنا ٹھنڈا ہوتا ہوگا ـــ تیری آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی ہوگی ـ لیکن ماں، تیرے بیٹے جب شہرت کی آخری بلندیوں کو چھو رہے ہوتے تو موت ان کے قدموں کے نیچے سے سیڑھی کھسکا رہی ہوتی ـ

اور پھر اب تُو ہے، یادیں ہیں، دھریک کا درخت ہے اور مجھے وہ چھوٹی سی نظم یاد آ رہی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ماں باغِ بہشت کا ایک ایسا درخت ہے کہ جب اس کے پھول مرجھاتے ہیں تو اس کی جڑیں مردہ ہو جاتی ہیں ـ تیرے پھول مرجھائے رہے اور پتا نہیں تیرے دل پر کیا گزرتی رہی ـــ ظریف کی موت کے بعد تُو نے زندگی کا جتن کیا ـــ مردانہ وار زندگی کا مقابلہ کیا ـــ اور جب تیرا ایک اور بیٹا مرا تو بھی تیرے دل نے صبر کیا اور اب تیرا سب سے ہونہار بیٹا منو بھی دنیا سے اٹھ گیا

ہے۔ اس گھاؤ کو برداشت کرنے کی ہمت بھی پیدا کر لے ماں — تجھے ابھی زندہ رہنا ہے —

ماں جی، تو نے کہا تھا — "میں نے آج تک منہ بھر کر منور کو کبھی اپنا بیٹا نہیں کہا — اسے ویر کہتی ہوں، بھرا کہتی ہوں، یہ خدا کی امانت ہے — خدا ان کو زندگی دے —"

اور اب ماں تیرا وہ بیٹا بھی دنیا سے اٹھ گیا ہے جسے تو نے کبھی منہ بھر کر اپنا بیٹا نہ کہا تھا — تیرا وہ ویر بیٹا — تیرا بھرا — جس کی زندگی کی تو دعائیں مانگتی رہی، اس دنیا سے چلا گیا ہے — ماں، تو نے کہا تھا، یہ خدا کی امانت ہیں — ہاں ہاں — ہم سب اس کی امانتیں ہیں، لیکن یہ امانتیں اپنے خون اور اپنی روح سے تخلیق ہوئی ہیں پھر خدا ان امانتوں کو ہم سے اتنی جلدی واپس کیوں لے لیتا ہے۔

ماں تو بڑی سیانی ہے — ماں جو ہوئی — اور ماؤں سے بڑھ کر اپنے بچوں کے لیے اور کون سیانا اور عقل مند ہو سکتا ہے — تیری ہی طرح — ماں ایک سیانا آدمی آج سے ہزاروں برس پہلے پیدا ہوا تھا — اس کا نام سقراط تھا — اس سے کسی نے ایک بار پوچھا :

"جنگ اور امن میں کیا فرق ہے؟"

تو ماں اس نے جواب دیا تھا :

"امن کا زمانہ وہ ہے جب جوان بیٹے اپنے بوڑھے والدین کے جنازوں کو کندھا دیتے ہیں — جنگ کا زمانہ وہ ہے جب بوڑھے والدین اپنے بیٹوں کو قبرستان چھوڑنے جاتے ہیں —"

اور آج میں سوچتا ہوں — ماں — تو سدا جنگ کے زمانے میں ہی سانس لیتی رہی — تو نے امن کے دن دیکھے ہی نہیں۔ تیری زندگی تو قصہ محشر بنی رہی — ایک

قیامت کے بعد دوسری قیامت تجھ پر ٹوٹتی رہی — قیامت کے ان لمحوں میں تو کیسے سوتی ہو گی — کیسے کیسے سوچتی ہو گی —

ماں — تو بڑی جری ہے — بڑی بہادر ہے —

ماں — میں تجھے سلام کرتا ہوں —

ماں — ہم تیرے گھر، پیارے گھر میں تجھ سے ملے تھے اور تیرے سارے بیٹوں کی تصویر بنانے لگے تھے تو تیرے ویر بیٹے منور نے کہا تھا، ظریف صاحب کی تصویر بھی ساتھ رکھ لیں، تاکہ ہم پانچوں بھائی اکٹھے ہو جائیں —

اور آج تیرے تین بیٹے موت کی گہری ابدی نیند سو رہے ہیں —

ماں، تیرے سمندر دل میں کیا ہے، اسے کون جان سکتا ہے —

ماں، تو نے بڑے بیٹے ظریف کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا:

"خدا جانے اب اس سے کب میل ہو گا؟"

ہاں ماں — اب تیرے دو اور بیٹے بھی بڑے بیٹے کے پاس چلے گئے ہیں — ان دنوں وہیں ایک دوسرے سے ملی ہوں گی — ان تینوں کا جب میل ہوا ہو گا تو وہ تیرے لیے کیسے نہ تڑپے ہوں گے —

ماں، گھروں کو بنانے والی ماں — یہ زندگی کا میلہ ایسے ہی ہے — آج وہ نہیں، کل ہم نہیں — لیکن ماں — تیرا دل سمندر کی طرح ہے — تجھے ابھی اپنے دوسرے بیٹوں، اپنے پوتوں کے لیے زندہ رہنا ہے —

تجھے ساری دنیا کے لیے زندہ رہنا ہے، کیونکہ ماں کی دعا صرف ایک کے لیے نہیں ہوتی بلکہ سب کے لیے ہوتی ہے —

تیرے بیٹوں کے نام ان کے فن کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور لوگ تجھے بھول جائیں گے کہ تو کتنی عظیم، کتنی مہربان تھی —

بڑے بیٹوں کی سادہ ماں — سبھی لوگ ماؤں کو نہیں بھولتے — جب بھی بیٹوں کا ذکر آتا ہے، اس کی ماں کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ کیسی ماں تھی، جس نے ان دلاوروں، ان شجاعوں، ان فن کاروں کو جنم دیا —

اور عظیم ماں — ہم سب تیرے غم میں شریک ہیں۔ ہم جو تیرے بیٹوں کے پرستار تھے، دوست تھے — جو جانتے ہیں کہ جو بوٹے تو نے لگائے، انہیں موت کی ہوائیں اجاڑ گئیں، لیکن ان کے نام صفحہ ہستی پر ہمیشہ ثبت رہیں گے — اور ماں، مرنا تو سب نے ہے — بڑی بات تو یہ ہے کہ مرنے والوں کا جسم تو مرجاتا ہے لیکن ان کا فن زندہ رہے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وہ ماں کتنی عظیم ہوتی ہے جو بڑے بیٹوں کو جنم دیتی، ان کی شہرت کے سورج کو نصف النہار کو پہنچتے دیکھتی اور پھر ان کی موت کا گہرا گھاؤ سینے پر کھا کر زندہ رہتی ہے —

ماں، تو نے جو گھر بنایا تھا، وہ ہمیشہ قائم رہے گا — اس گھر میں تیرے پوتے پوتیاں کھیلیں گے — تجھے یاد رکھیں گے اور موت بھی اس گھر کو نہ اجاڑ سکے گی — کیونکہ اس گھر، پیارے گھر کو ایک ایسی ماں نے بنایا تھا جس نے اپنے بیٹوں کے جنازوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے اٹھتے دیکھا تھا

ایسے گھر ہمیشہ قائم رہتے ہیں ماں —

ماں تو عظیم ہے —

اور دنیا بھر کے بیٹے تجھے سلام کرتے ہیں —

تمہارے ان گنت ان دیکھے بیٹوں میں سے —

ایک بیٹا،

ستار طاہر

مہندر ناتھ سرلا دیوی کی موت پر

کرشن چندر کو پرسہ

دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو سب کے ہوتے ہیں۔ نسل، رنگ، مذہب، قوم اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا، سچے فن کار، ادیب، شاعر، محبت کرنے والے، آزادی کی جنگ لڑنے والے، صلح کا پرچم اٹھانے والے، محبت کی شمع فروزاں کرنے والے، غربت، جہالت اور فلاکت کے خلاف جہاد کرنے والے، انسانوں میں محبت کا جذبہ بیدار کرنے والے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو جنگ ہو یا امن، نفرت کا دور ہو یا دشمنی کا زمانہ، ہر دور میں یکساں محبوب ہوتے ہیں — ایسے ہی چند ساجھے اور بڑے آدمیوں میں سے ایک — کرشن چندر ہیں —

اردو ادب کا یہ عظیم لکھنے والا، ایک تحریک بن چکا ہے — ایک ایسی تحریک جو محبت، امن اور انسانی خوشحالی کی تحریک — کرشن چندر کم از کم گزشتہ چالیس برس سے لکھ رہے ہیں — اردو کا یہ عظیم مصنف، ان معدودے چند لکھنے والوں میں سے ایک ہے جو — جو لکھتے ہیں، جس نظریے کا پرچار کرتے ہیں، اس پر خود بھی عمل کرتے ہیں، اگر وہ محبت کی تبلیغ کرتے ہیں تو خود ان کی اپنی ساری زندگی انسانوں سے محبت کرتے گزری ہے، اگر انہوں نے غربت کے خلاف جہاد کیا ہے، تو خود انہوں نے بھی اپنی زندگی میں غریبوں کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اگر وہ صلح اور امن کے پرچارک ہیں تو ان کی ساری زندگی خود بھی صلح اور امن میں کٹی ہے۔ انہوں نے

کسی سے نفرت نہیں کی، سوائے ان چیزوں کے جو واقعی نفرت کے قابل ہیں۔
ان کی انسان دوستی، شرافت، فراخدلی اور وسیع القلبی کی داستانیں برصغیر میں پھیلی ہوئی ہیں — آج بھی آغا طالش جیسے آدمی کے سامنے کرشن چندر کا ذکر آئے تو آغا طالش کا چہرہ محبت سے چمک اٹھتا ہے۔ آج بھی ملا ؤالدین سے کرشن چندر کی بات چھیڑی جائے تو علاؤالدین اس کی انسانیت کے قصے سنانے لگتے ہیں — مرحوم تنویر نقوی تو کرشن چندر کی باتیں کرتے تھکتے ہی نہ تھے —

کرشن چندر نے کتنا لکھا ہے، کتنا حسین اور جاندار ادب تخلیق کیا ہے۔ اردو اور عالمی ادب میں ان کا کیا مقام ہے۔ ان کی نثر — کیسی ہے، اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ کرشن چندر نے پڑھنے والوں کی کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ لکھنے والوں کی کس طرح حوصلہ افزائی کی ہے اور کتنے لکھنے والے براہِ راست ان سے اور ان کے فن سے متاثر ہوئے ہیں — ان کی گنتی نہیں کی جاسکتی — ان کی تخلیقات کی تاثیر کے دائرے میں ایک طرح سے ساری دنیا اسیر ہے — دنیا کی شاید ہی کوئی زبان ہوگی جس میں ان کی تخلیقات کا ترجمہ نہیں ہوا —

کرشن چندر نے افسانوں، ناولوں، خاکوں، تنقید، طنز و مزاح اور بچوں کے ادب کے علاوہ ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے ہیں — فلمیں اور فلموں کے ڈائیلاگ لکھے ہیں اور فلمیں پروڈیوس اور ڈائریکٹ بھی کی ہیں، جن میں ان کی ایک فلم "سرائے کے باہر" کا بڑا شہرہ ہے، غالباً یہی وہ فلم ہے جس میں آغا طالش پہلی بار بطور اداکار آئے تھے اور انہوں نے جانی لنگڑے کا کردار ادا کیا تھا — پچھلے دنوں امرت سر ٹی وی سے یہ کھیل ٹیلی کاسٹ ہوا تھا — اس کا ذکر میں ذرا بعد میں کروں گا۔

جب سے کرشن چندر نے لکھنا شروع کیا اور دائمی شہرت حاصل کی ہے، اردو

کا شاید ہی کوئی ایسا قاری ہوگا جس نے کرشن چندر کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ اسی طرح ہر لکھنے والے کا سابقہ کرشن چندر سے ضرور پڑتا ہے ___ یوں لگتا ہے، جیسے انہیں پڑھے بغیر نہ تو قاری کا مطالعہ ہی مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ہی لکھنے والے کی تخلیقات ہی کرشن چندر سے آنکھیں چرا سکتی ہیں۔

ہم نے کرشن چندر مطالعہ ابتدائی طالب علمی کے دور میں شروع کیا تھا۔ ۱۹۴۵، ۱۹۴۶ء میں کرشن چندر کو پڑھنا شروع کیا اور تب سے اب تک پڑھتے چلے آرہے ہیں ___ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کرشن چندر کی کوئی تخلیق سامنے آئی ہو تو ہم نے اسے نہ پڑھا ہو، بلکہ ایسا ہوا ہے کہ ان کی بعض کہانیاں ہم نے درجنوں بار پڑھی ہیں اور اب بھی کئی بار جی چاہتا ہے کہ ان کی بعض تخلیقات کا پھر سے مطالعہ کیا جائے ___

کرشن چندر ایک عہد ساز لکھنے والے ہیں۔ انہوں نے عہد آفرین تخلیقات لکھی ہیں ___ کرشن چندر کے شاہکار افسانوں اور دوسری تخلیقات کی فہرست بنائی جائے تو وہ خاصی طویل ہوگی ___ یہ بھی حقیقت ہے کہ جتنے قاری کرشن چندر کو ملے ہیں، اتنے قاری شاید ہی اردو کے کسی دوسرے لکھنے والے کو نصیب ہوئے ہوں اور جتنے چاہنے والے اور مداح کرشن چندر کے ہیں، شاید ہی کسی اور کے ہوں۔

۱۹۶۱ء یا ۱۹۶۲ء میں ہم نے کرشن چندر کو ایک خط لکھا تھا ___ ایک ڈیڑھ ہفتے کے بعد ان کا جواب آیا۔ اس خط میں محبت کی وہ مہک تھی جو ان کی عظیم تخلیقات کا جوہر ہوتی ہے۔ اس مختصر سے خط میں بھی وہی انسانیت دوستی تھی جو کہ کرشن چندر سے ہی مخصوص ہو چکی ہے۔ اس کے بعد گاہے بگاہے ہم انہیں خط لکھتے رہے وہ ہمیں جواب سے نوازتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانے میں یہ سلسلہ منقطع ہوگیا ___ اور ایک طویل مدت تک ہمارا کسی طور کرشن چندر سے خط و کتابت کا رابطہ

قائم نہ ہو سکا۔ اس دوران میں ہم سنتے اور پڑھتے رہے کہ کرشن چندر کو ۱۹۶۵ء کی جنگ کا بے حد افسوس ہوا ہے — انہوں نے بھارت کے پراپگنڈے کا حصہ بننے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے نہ پاکستان کی مخالفت کی، نہ ہی بھارت کی حمایت، بلکہ امن کے لیے راہ ہموار کرتے رہے۔ دلوں میں محبت کی بجھتی ہوئی شمع کو آندھیوں سے بچانے میں لگے رہے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد ۱۹۷۱ء میں ہم پر جو المیہ گزرا، کرشن چندر اس میں بھی بھارت کے حمایتی بن کر سامنے نہ آئے بلکہ انسانیت، امن اور محبت کا پرچار کرتے رہے۔ اس دوران میں جب بڑے بڑے ترقی پسند ڈول گئے اور انہوں نے پاکستان کے خلاف زہر آلود باتیں کیں، کرشن چندر کا قلم محبت کا نغمہ بوتا رہا۔ وہ اپنے مسلک سے نہ پھرے۔

۱۹۷۵ء میں یہی دو تین مہینے پہلے ہم نے کرشن چندر کو خط لکھا۔ اس خط کی تحریک ہمیں کئی وجوہات سے ہوتی تھی۔ ایک تو وہی کرشن چندر کی محبت تھی جو اب بھی دل میں موجود تھی — اب بھی ان کی کہانیاں پڑھ کر سر ان کی عظمت کے سامنے جھک جاتا اور ہمارے قلم کو حسرت ہونے لگتی تھی کہ ہم بھی اگر اور کچھ نہیں تو چند جملے ہی کرشن چندر جیسے لکھ سکیں۔ لیکن — اے بسا آرزو، ہم آج تک بہت کچھ لکھنے کے باوجود — کرشن چندر جیسے چند جملے نہ لکھ سکے! بہر حال یہ تو دل کی بات ہوئی۔ اصل وجہ ایک یہ تھی کہ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ کا انتقال ہو گیا تھا اور ہم مہندر ناتھ کے بھی قاری تھے اور کرشن چندر کو افسوس کا خط لکھنا چاہتے تھے —

احمد آہی کے ساتھ بیٹھے ایک دن بہت دیر تک مہندر ناتھ کا ذکر ہوتا رہا تھا۔ مہندر ناتھ بہت اچھے افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ ان کے ناول "آدمی اور سکے" کا شمار تو اردو کے چند اچھے ناولوں میں ہونا چاہیے۔ مہندر ناتھ نے

بھی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھے تھے اور اداکاری کے جوہر بھی دکھلائے تھے۔ "سرائے کے باہر" میں شاعر کا کردار انہوں نے ہی ادا کیا تھا۔ کرشن چندر کا سارا خاندان تخلیق کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ خود کرشن چندر، پھر مہندر ناتھ ان کی بہن سرلا دیوی اور ان کے بہنوئی ریوتی سرن شرما۔ یہ سب اردو کے اچھے لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ہم نے کرشن چندر کو مہندر ناتھ کی موت کے حوالے سے خط لکھا۔ کرشن چندر نے جواب دیا اور یوں خطوط کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ کرشن چندر۔ مہندر ناتھ پر ایک خصوصی نمبر مرتب کر رہے ہیں۔ انہوں نے خط میں اس کا ذکر بھی کیا۔ پھر ایک دن ہمیں کرشن چندر کا ایک مختصر سا خط ملا کہ ان کی بہن سرلا دیوی بھی ایک حادثہ میں انتقال کر گئی ہیں۔ ہمیں بے حد صدمہ ہوا۔ کرشن چندر کے دل پر کیا گزری ہوگی۔ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس خط کے چند دنوں کے بعد امرت سر ٹی وی سے ہم سلمٰی صدیقی کا انٹرویو سنا۔ اس میں بھی انہوں نے سرلا دیوی کی بے وقت موت کا ذکر کیا۔

آج اگر ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں تو ذاتی حیثیت میں نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کی طرف سے کرشن چندر کو پُرسہ دے رہے ہیں جو پاکستان میں ان کے مداح ہیں جو ان کے قاری ہیں اور ان کی تخلیقات پر جان دیتے ہیں جو کرشن چندر کے عظیم ادب اور تخلیقات کی وجہ سے انہیں اپنا سمجھتے ہیں۔

کرشن چندر کو ہم نے پچھلے دنوں امرت سر ٹی وی پر دیکھا۔ وہ اپنے کھیل "سرائے کے باہر" کے بارے میں چند تعارفی جملے کہہ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر وہی معصومیت اور سادگی تھی جس کا شہرہ ہم برسوں سے سُنتے آرہے تھے ——

اس سادہ معصوم چہرے والے انسان پر اپنے بھائی دوست اور بہن کی موت نے کیا ستم نہ ڈھایا ہوگا۔ اس دُکھ میں ان کا ہر پڑھنے والا شریک ہے!!

کرشن چندر

میری قلم سے لکھی ہوئی بہت سی چیزیں آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان میں میں نے کتنے ہی لوگوں کی موت پر افسوس اور غم کا اظہار کیا ہے۔ کتنے ہی اداکاروں، فن کاروں اور لکھنے والوں کی موت پر نوحہ لکھا ہے۔

لیکن آج جب میں —— کرشن چندر کی موت پر یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو میرا دل اور میرا قلم مجھ سے کہتا ہے۔ —— کہ کاش، یہ سطور میں نہ لکھتا۔

کرشن چندر —— عظیم ترین تھا۔ اردو ادب میں اس کی کنٹری بیوشن بے بہا ہے۔ اس کی عطا لافانی ہے، وہ انسانی حسن اور انسانیت کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ اس جیسا لکھنے والا —— نہ پہلے کوئی اردو کو نصیب ہوا، نہ پھر کبھی ہوگا۔ —— وہ منفرد تھا —— اس کی تقلید کرنے والے سینکڑوں، اس سے فیض اٹھانے والی نسلیں ہیں۔ اور آنے والے دور کی نسلیں بھی اس کے فن سے فیض اٹھاتی رہیں گی لیکن کرشن چندر، کی جگہ کوئی نہ لے سکے گا۔

وہ عظیم انسان تھا —— عالمگیر شہرت حاصل کرنے کے باوجود اس کے چہرے پر ایک ایسی معصوم مسکراہٹ کھلی رہتی تھی، جو اس کی انسانیت، اس کی عاجزی، اس کی محبت اور اس کی عظمت اور انسانی دردمندی کی علامت تھی۔

وہ جادوگر تھا —— اس کی نثر میں وہ حسن تھا جو شاید ہی کسی کے پاس اس

دور میں ہو ۔۔ اس کے ہاں نثر کا حسن، ابلاغ اور خیال یوں یکجا ہوئے تھے کہ شاعری کے قریب پہنچ گئے تھے، بلکہ بعض جگہ تو اس کی نثر شاعری سے بھی برتر دکھائی دیتی ہے ۔۔

وہ کرشن چندر ۔۔۔ جو انسانیت کا ادیب تھا ۔۔ جو پوری انسانیت کے لیے لکھتا تھا، جو انسان کے دکھوں اور غموں کا ترجمان تھا ۔۔ جس نے انسانی مجبوریوں اور انسانی عظمتوں کو نئی زبان دی تھی ۔۔ وہ کرشن چندر اس دنیا سے اٹھ گیا ہے۔

اس کی موت میرا ذاتی نقصان بھی ہے، میرا ذاتی غم بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اردو کا ہر وہ قاری جس نے کرشن چندر کو پڑھا ہے، اس کی موت کو اپنا ذاتی دکھ محسوس کرے گا۔ اس کی موت ۔۔۔ میرے لیے بہت بڑا دھماکا ثابت ہوئی۔ جس نے میرے ذہن اور وجود کو ہلا کر رکھ دیا ۔۔

کرشن چندر مدتوں سے علیل تھے۔ دل کا دورہ پڑا تھا۔ عصمت چغتائی جب پاکستان آئیں تو ان سے پتا چلا تھا کہ اب وہ رو بصحت ہیں اور بمبئی کے ایک ہسپتال میں ان کا خصوصی علاج ہو رہا ہے ۔۔ پھر سنا کہ وہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ لیکن صحت یاب ہو کر گھر آ گئے ہیں ۔۔ اور ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو خبر آئی کہ وہ چل بسے ہیں ۔

۷ مارچ کا ہنگامہ خیز دن گزر گیا تھا، لیکن اس کے سائے ۸ مارچ پر بھی چھائے ہوئے تھے ۔۔ میں کئی "دردِ دل" میں ان دنوں مبتلا ہوں ۔۔ بعض اوقات مایوسی کی حد کو چھو لیتا ہوں ۔۔ سات اور آٹھ کی درمیانی شب جاگتے گزری تھی ۔۔ کچھ درد سہتے، کچھ ٹی وی پر انتخابی نتائج دیکھتے ۸ مارچ کو میں بے حد مضمحل بے حد تھکا ہوا تھا اور جب شام کو ہی بستر پر لیٹا تو ساڑھے چھ بجے کی پنجابی خبروں میں کرشن چندر کی موت کی خبر لاہور ٹی وی سے سنی ۔۔ مجھے یوں لگا جیسے

میرے جسم کا ایک حصہ سُن ہو گیا ہو۔ جیسے میرا دل چند لمحوں کے لیے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ میں نے جھٹ سے امرت سر ٹی وی لگایا جہاں کرشن چندر کے بارے میں ایک پروگرام دکھانے کا اعلان ہو رہا تھا۔

اچھا تو کرشن چندر مر گئے۔

اس دنیا میں انسان کیسی کیسی امنگیں اور حسرتیں دل میں پروان چڑھاتا ہے اور میرے دل کی ایک آرزو یہ تھی کہ کبھی کرشن چندر سے ملاقات ہو گی۔

جب کرشن چندر کی بیوی سرلا دیوی کا ایک حادثہ میں انتقال ہوا تو کرشن چندر نے مجھے ایک مختصر سے خط میں سرلا دیوی کے انتقال کی خبر دی تھی — میں نے انہیں پُرسے کا طویل خط لکھا — میں جانتا تھا کہ سب انسانوں کے غموں پر دُکھ محسوس کرنے والا کرشن چندر ان دنوں کتنا اداس ہو گا — اس کے بھائی مہندر ناتھ کا انتقال بھی کچھ عرصہ پہلے ہوا تھا اور کرشن چندر نے مجھے لکھا تھا کہ وہ ان دنوں مہندر ناتھ کی یاد میں ایک خاص نمبر ترتیب دے چکے ہیں جو اب چھپنے والا ہے اور وہ جونہی چھپے گا، مجھے بھجوائیں گے — سرلا دیوی کی موت کے بعد ان کے اطلاعی خط کے بعد میرے خط کے جواب میں ایک عرصے تک ان کا کوئی خط مجھے نہ ملا — میں ان کے جواب سے مایوس سا ہو رہا تھا کہ ان کا خط آیا — وہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میری ایک عزیز متاع کی حیثیت رکھتا ہے — یہ خط خاصا طویل تھا۔ اس میں کرشن چندر نے جہاں میرزا ادیب کو بہت بہت پیار لکھا تھا — وہاں فیض صاحب کا پتا بھی پوچھا تھا اور پھر خط کے آخری حصے میں انہوں نے ایک ایسا جملہ بھی لکھا تھا کہ جسے پڑھ کر میں جہاں بے حد اداس ہوا، وہاں یہ خیال بھی دل میں آیا کہ شاید اب کرشن چندر سے ملاقات کی دیرینہ خواہش پوری ہو جائے — کرشن چندر نے لکھا تھا :

"زندگی کی اس شام میں میری یہ بڑی آرزو ہے کہ میں لاہور آؤں اور
اپنے احباب اور دوستوں سے مل سکوں"

کرشن چندر لاہور آنے سے پہلے ہی اس دنیا سے چل بسے —
میری آرزو میرے دل میں ہی دفن ہوگئی — میں ان سے کبھی نہ مل سکوں گا —

آج مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں کرشن چندر سے کب متعارف ہوا — ان کی پہلی تحریر کب پڑھی، لیکن مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ سکول کے دنوں میں انہیں پڑھا اور تب سے میں ان پر فریفتہ ہوگیا — کالج میں تھا کہ جب میں نارووال کے ایک گاؤں میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گیا تھا — وہاں میں نے ایک کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر، ایک چھدری چھاؤں والے درخت کے سائے میں پہلی بار "شکست" کو پڑھا تھا۔ آج تک اس کی لذت میرے اندر موجود ہے — میں نے کرشن چندر کی ہر وہ چیز پڑھی جو میری دسترس میں تھی — شاید ہی ان کی کوئی کہانی یا مضمون ہو، جسے میں نے نہ پڑھا ہو — اب سوچتا ہوں کہ ان کی کون سی امر کہانیوں کا ذکر کروں۔ "ان داتا" کا۔ "تائی ایسری" کا۔ "دو فرلانگ لمبی سڑک" کا — "کالو بھنگی" کا۔ "پریتو" کا۔ "تین غنڈے" کا یا "زندگی کے موڑ پر" کا۔ "غالیچہ" کا یا "ایک سوشیل تصویر" کا — ناول "شکست" کا یا ناول "طوفان کی کلیاں" کا — "ہوائی قلعے" کے مزاحیہ مضامین کا — "ایک گدھے کی سرگزشت" جیسے طنز کا — یا اردو کے پہلے رپورتاژ "پودے" کا۔

اس کی کس کس چیز کا ذکر کیا جائے — ہر تحریر انسانیت کے درد سے لبریز ہے — سماجی حقیقت اور کرشن چندر کے اپنے الفاظ میں "انقلابی رومانویت" میں بھیگی ہوئی تحریریں جو دلوں پر فوری اثر کرتی ہیں، جو کبھی بھلائے نہیں بھولتی ہیں۔

وہ عہد ساز تھا — وہ ادیب ساز تھا — بمبئی میں اس کا گھر مفلوک الحال بے کار ادیبوں اور اداکاروں کا ٹھکانا تھا — لاہور میں وہ جب تھا تو دوسروں کے

مسودے بولنے میں اپنا کام بھول جایا کرتا تھا۔ وہ دوسرے کو دکھ میں دیکھ نہیں سکتا تھا اس نے کتنے ہی انسانوں کو جو اس کے قریب آئے اور جنہوں نے اسے پڑھا جینے کا قرینہ سکھایا تھا — زندگی کا نیا ولولہ بخشا تھا۔ انسان اور فطرت سے محبت کرنا سکھایا تھا — ایک بہتر اور روشن مستقبل کی نوید دی تھی — انسانوں کو ایک مہذب معاشرے کی تعمیر کے لیے ایک فلسفہ دیا تھا۔ وہ چاہتا [illegible] تھا۔ مجھے یاد ہے ایک جگہ کرشن چندر نے لکھا تھا:

"یہ بات ہے کہ [illegible] تک باہر سے آتے تھے۔"

وہ ہر اس شخص کے پروگرام [illegible] جس میں ذرا سی ذہانت کی رمق دیکھ لیتا تھا — کتنے ہی لکھنے والوں کو اس نے شہرت تک پہنچایا۔

اردو فکشن میں خاص طور پر افسانے کی صنف میں جتنے تجربے کرشن چندر نے کیے، اتنے تجربے شاید ہی کسی اور لکھنے والے کے ہاں نظر آتے ہیں۔ "آگہی" سے "تائی ایسری" تک تجربات اور سماجی حقیقت نگاری کا ایک وسیع جہان پھیلا ہوا ہے۔

اور پھر اس کی نثر — "جب کھیت جاگے" کے دیباچے میں علی سردار جعفری نے لکھا تھا:

"اچھا ہوا، یہ شخص شاعر نہ ہوا؛ ورنہ بڑے بڑوں کے چراغ اس کے سامنے گل ہو جاتے —"

وہ معصوم، عظیم انسان تھا جو اردو ادب میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی روح رواں تھا اور خود بھی ایک تحریک اور ادارہ تھا۔

وہ انسان اور انسانیت سے کبھی مایوس نہ ہوا تھا — "غدار" پڑھیے۔ "ہم وحشی ہیں" پڑھیے — ۱۹۴۷ء کے فسادات میں بھی اس کے ہاں انسانیت کا شعلہ فروزاں رہتا ہے —

کرشن چندر نے افسانہ لکھا، مضمون لکھے، طنز لکھا، مزاح لکھا، ڈرامہ لکھا، فلمیں لکھیں، فلمیں پروڈیوس کیں (سرائے کے باہر خاص طور پر قابل ذکر ہے)، بچوں کے لیے لکھا، دنیا بھر کے انسانوں کے لیے لکھا۔

وہ عالمی ادیب تھا — اس کی تحریروں کے ترجمے دنیا کی کتنی ہی زبانوں میں ہو چکے ہیں — وہ روسی، پولش اور ہنگری اور انگریزی اور دنیا کی کتنی ہی ترقی یافتہ زبانوں کے حوالے سے ساری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے، پڑھا جاتا ہے اور ہمیشہ ان کے پرستاروں میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

خیالات کی یلغار ہے — کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ کیا تنویر نقوی کا ذکر کروں جو کرشن چندر کا عاشق تھا۔

کیا ابن انشا کا ذکر کروں — جنہوں نے مجھے کہا تھا کہ میں اپنی ہر تحریر بڑی محنت سے لکھتا ہوں کہ ممکن ہے وہ کرشن چندر کی نظروں سے بھی گزرے اور مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

یا ان خطوں کا ذکر کروں جو میرے پاس ہیں — جو کرشن چندر نے مجھے لکھے تھے —

ہاں، کس کس کا ذکر کروں — کرشن چندر نے اپنے انٹرویو (ٹی وی) میں کہا تھا:

"میں نے زندگی کی دھنک کے ہر رنگ کو دیکھا، سنا، محسوس کیا اور چکھا ہے۔"

اس کا دعویٰ درست تھا — اپنی زندگی ہی میں کرشن چندر نے اپنا دعوے ثابت کر دیا تھا — برصغیر کی تاریخ اور انسانوں کو سمجھنا اور پڑھنا ہو تو کرشن چندر سے برتر اور بہتر اور کوئی مصنف نہیں ملے گا۔

افسوس ہے آج۔ اس کی موت پر یہ سطور لکھتے ہوئے سوچتا ہوں '' اس کی دین اور عطا کا ہم کہاں تک شکریہ ادا کر سکتے ہیں — اس نے ہمیں انسانیت کا درد محسوس کرنا سکھایا۔

وہ مر گیا ——

اور مجھ جیسا آدمی اس پر یہ سطور لکھ رہا ہے
کاش! یہ کالم میں نہ لکھتا۔ کیا یہ پیارا ہمارے سامنے دنیا سے اُٹھ جائے گا — !

انشا جی تم زندہ رہو

کئی مہینے پہلے جب ابن انشا جی سے ملاقات ہوئی تو وہ لندن کے لیے رختِ سفر باندھ چکے تھے — ان کے چہرے کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ ان کی صحت خاصی خراب ہو چکی ہے۔ وہ تھکے تھکے نظر آ رہے تھے اور یہ تھکاوٹ بیماری اور بیماری سے پیدا ہونے والی نقاہت سے پیدا ہونے والی صورت تھی۔ شدید تھکن کی علامت کے باوجود ابن انشا حسبِ معمول اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ بعض مزے دار جملے بھی انہوں نے کچھ لوگوں پر کسے اور کچھ اپنے بارے میں بھی مخصوص انداز میں بتایا — اس وقت ان کے جملوں کو سنتے ہوئے بھی مجھے یہ احساس ہوا کہ اگرچہ وہ شگفتہ باتیں کر رہے ہیں، لیکن ان کے لہجے میں وہ پہلی سی شگفتگی نہیں ہے —

پھر انشا جی لندن چلے گئے — پھر ہم نے ان کا ایک خط ماہنامہ کتاب میں پڑھا اور ایک خط یا اس کا ایک ٹکڑا ماہنامہ "ماہِ نو" میں دیکھا — ابن انشا نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا تھا کہ وہ بیکر سٹریٹ میں مقیم ہیں — وہی بیکر سٹریٹ جسے سر آرتھر کانن ڈائل نے شرلاک ہومز کی قیام گاہ کے حوالے سے عالمگیر اور جاودانی شہرت بخشی ہے۔ اپنی اس رہائش گاہ کے بارے میں انہوں نے بہت مزے کے جملے لکھے تھے —

انشا جی کی بیماری کی سن گن تو ہو چکی تھی، لیکن ایک تو ان کے خطوں کی شگفتگی

اور پھر لندن میں بسلسلۂ علاج ان کی موجودگی کی وجہ سے کوئی پریشانی ان کے بارے میں پیدا نہ ہوئی — ایک دو بار جی میں آئی کہ انہیں خط لکھنا چاہیے۔ ان کے ایڈریس کے لیے کئی بار ذوالفقار احمد تابش اور سردار محمود سے رابطہ قائم کرنے کو جی چاہا، لیکن پھر اپنی تساہل پسندی اور غفلت کی وجہ سے ان سے رابطہ قائم نہ ہو سکا —

اور پھر "فنون" کے ایک شمارے میں ان کی ایک نظم پڑھی — یہ نظم انہوں نے لندن میں لکھی تھی اور وہیں سے اشاعت کے لیے بھیجی تھی —

اس نظم کا عنوان اور مصرعہ ہے :

"جب عمر کی نقدی ختم ہوئی"

یہ ایک عجیب نظم ہے — اس نظم کو پڑھ کر جانے کیوں گلا رندھ گیا۔ یہ نظم ایک ایسے شاعر کی ہے، جسے ہمیشہ زندگی عزیز رہی اور جو سدا حسن سے لگاؤ رکھتا رہا۔ لیکن اسی نظم میں وہ اپنی زندگی کے بارے میں ایسی شدید مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لگتا ہے کہ موت کا خوف اور زندگی سے مایوسی کا احساس پڑھنے والے پر بھی طاری ہو جاتا ہے ؎

انشاء جی نے بہت کچھ لکھا — ان کی بعض نظمیں اور بعض غزلیں اردو شعری کا سرمایہ ہیں امانت علی خان کی گائی ہوئی غزل آج بچے بچے کی زبان پر ہے :

ع انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو

اس شہر میں جی کا لگانا کیا

اس غزل میں بھی زندگی کی ناپائیداری، موت کے کرب، جدائیوں کے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ مجموعی طور پر اپنے تسلسل کی وجہ سے یہ غزل نظم کے بے حد قریب ہے، لیکن جو کرب، جو ذاتی احساس موت ان کی اس نظم :

جب عمر کی نقدی ختم ہوئی

میں ہے' وہ ان کی ساری شاعری میں نہیں ملتا — وہ شاعر جو خود بنجارہ تھا' نگر نگر دیس دیس ملک ملک گھوما اور شگفتہ انداز میں سفرنامے لکھتا رہا' جس نے اردو شاعری میں "بنجارہ" نو نئے معنی اور نئے اسلوب میں پھر سے پیش کیا' جس نے اردو میں طنز و مزاح کا ایک نیا اسلوب ایجاد کیا۔ وہ لندن میں — بیٹھا — عمر کی نقدی کے ختم ہونے کے دوران ہوا احساس میں مبتلا ہے اور چند دنوں' تھوڑے سے وقفے اور تھوڑی سی زندگی کے لیے بھیک مانگتا ہے اور اسے یہ بھی احساس ہے کہ عمر میں کسی کی دی ہوئی زندگی سے اضافہ نہیں ہو سکتا — اس احساس نے اس نظم کے کرب کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

موت کے بارے میں ملکی اور غیر ملکی ادب میں کئی عظیم فن پارے موجود ہیں۔ صدیوں سے جب سے انسان پیدا ہوا اور اس نے پہلی بار موت کا ذائقہ چکھا' تب سے موت کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے — اس کے باوجود یہ نظم۔ اپنے ذاتی دکھ' ذاتی واردات اور تجربے کا ایک ایسا اظہار ہے کہ جس کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔

اس نظم کو پڑھنے کے بعد میں نے ابن انشا کا کہیں سے پتا حاصل کیا اور انہیں خط لکھا۔ ان کے جواب سے میں اب تک محروم ہوں' لیکن ان سے گلہ نہیں — وہ کراچی میں تھے تو تب بھی جواب دیر سے ہی دیا کرتے تھے اور مجھے اب بھی یقین ہے کہ مجھے اپنے خط کا جواب ضرور ملے گا —

چند دنوں سے اخباروں میں ایک اپیل شائع ہو رہی ہے کہ ابن انشا بیمار ہیں۔ ڈاکٹر مایوس ہو چکے ہیں۔ انہیں سرطان ہے اور اس اپیل میں استدعا کی گئی ہے کہ ان کی صحت کے لیے دعا کی جائے — منو بھائی نے' انتظار حسین نے کالم لکھے ہیں۔ انشا جی کے ساتھ اپنے تعلقات اور ان کی شگفتہ مزاجی کا تذکرہ کیا ہے اور دعا مانگی ہے۔

انشا جی — وہ سب لوگ جو آپ کو جانتے ہیں' جن کا زندگی میں کسی طور سے آپ سے رابطہ رہا — ذاتی تعلق یا آپ کی تحریروں اور شاعری سے واسطہ پڑا' وہ سب

لوگ، لاکھوں لوگ آپ کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ وہ سب اپنے پیارے شاعر، اپنے سیاح دنیا ہے، اپنے طنز و مزاح نگار کے لیے سچے دل سے صحت کی دعا مانگ رہے ہیں —

انشا جی، وہ سب لوگ جو آپ سے کبھی نہیں ملے اور جن سے آپ بھی نہیں ملے، ہاتھ اٹھائے آپ کے لیے دعا مانگتے ہیں۔

انشا جی تم زندہ رہو —

انشا جی — عمر کی نقدی ایک دن ختم ہو ہی جاتی ہے۔ آپ کو اس حقیقت کا احساس ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ کوئی کسی کے کاسۂ حیات میں زندگی کے دن نہیں ڈال سکتا — اپنی زندگی، اپنی زندگی ہوتی ہے اور اپنی موت اپنی موت ہوتی ہے۔ اس کے باوجود انشا جی آپ دعا کی قوت اور تاثیر سے بھی واقف ہیں — انسان کو انسان کی دعائیں موت کی دہلیز سے بھی کھینچ کر لے آتی ہیں اور سچے دل سے مانگی جانے والی دعائیں کبھی رائیگاں نہیں جاتی ہیں اور جو ان گنت لوگ آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ وہ آپ کے مداح ہیں۔ آپ سے پیار کرتے ہیں۔ وہ آپ کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ میں وہ حس مزاح ہے جو بسورتے اور دکھی لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کر دیتی ہے۔ آپ کے ترکش میں طنز کے وہ تیر ہیں جو ابھی چلے ہی نہیں۔ آپ کے احساسات میں وہ توانائی اور شدت ہے کہ ابھی شاعری کو آپ کی ضرورت ہے۔

انشا جی — چاند نگر کے آپ باسی نہیں — آپ تو اس بستی کے ایک کوچے میں بستے ہیں جو ہمارے دل ہیں — آپ زندہ رہیں گے۔

آپ نے ایک بار لکھا تھا:

شب دوازدہم، شب اگست کے نیمہ
میرے عزیز کہیں اور جا کے دستک دے

رہا نہیں ہے محبت کے نام کا کوئی
نہیں نہیں یہاں انشاء کے نام کا کوئی

یہ شاعرانہ بات تھی — جس کے حوالے سے آپ نے دنیا میں [illegible]
کیا تھا —

لیکن آپ یقین کیجیے —

چاند آپ کو تلاش کرتا رہے گا۔ آپ کے دل اور دروازے پر دستک دیتا رہے گا — آپ محبت کا نور پھیلاتے رہیں گے اور ابنِ انشاء نام کا شخص۔ شاعر سیاح اور طنز و مزاح نگار ہمیشہ زندہ رہے گا

انشاء جی، ہم سب آپ کے لیے دعاگو ہیں — خدا کے حضور ہاتھ پھیلائے ہوئے ہیں کہ وہ آپ کی عمر دراز کرے۔ آپ صحت یاب ہو کر وطن آئیں۔ شعر کا جادو جگائیں۔ طنز کے وار کریں۔ روتوں کو ہنسائیں اور آپ کے ساتھ زندگی — ادب۔ شعر کے جو امکانات وابستہ ہیں انہیں پورا کریں۔

انشاء جی، تم زندہ رہو
یہ ہم سب کی دعا ہے
آمین!

زنجیر پڑی دروازے پر

چند دن پہلے جب میں ابن انشاء کی صحت کے لیے دعائیہ کالم لکھ رہا تھا تو اس وقت مجھے ایک دوست کے حوالے سے پتہ چلا تھا کہ لندن میں ابن انشاء کے معالجوں نے اطلاع دی ہے کہ آخری حد آ چکی ہے اور اب ابن انشاء کا زندہ رہنا ناممکن ہو چکا ہے۔ "انشاء جی تم زندہ رہو" والا کالم پریس میں چھپ رہا ہوگا کہ ابن انشاء کی موت کی خبر آگئی اور اس وقت جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ابن انشاء کا جسد خاکی منوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے دب چکا ہے۔

ابن انشاء کی موت کے ساتھ ہی ایک ایسے دروازے میں زنجیر پڑ گئی ہے جس کو کھلا رہنا چاہیے تھا — خود ابن انشاء کی ایک نظم ہے۔

دروازہ کھلا رکھنا —

اس نظم کو پڑھ کر نہ جانے کیوں لورکا کی نظم "بالکونی" یاد آجاتی ہے: بہرحال یہ تو بیچ میں بات آگئی — اصل بات یہ تھی کہ انشاء جی کی موت سے ایک ایسا دروازہ بند ہوگیا ہے جو ان کی زندگی میں کھلا تھا تو سینکڑوں ہزاروں لوگ اس کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر زندگی کی نئی حرارت اور توانائی حاصل کرتے تھے — اس دروازے کے اندر ابن انشاء نے ایک بڑا خزانہ چھپا رکھا تھا — شعر کا خزانہ، سفرناموں کا خزانہ — کالموں کا خزانہ — ابن انشاء

کی شاعری دلوں کو نیا گداز بخشتی تھی تو ان کے سفرنامے ہمیں اس اپنی دنیا سے دور لے جا کر جہاں دوسری دنیاؤں کی سیر کراتے ہیں۔ وہاں انسانوں کے ساتھ ایک خاص رشتے اور رابطے کی بنیاد بھی فراہم کرتے تھے — ابن انشا کے کالم اپنے مخصوص اسلوب میں ہمیں ہنساتے تھے — ہمیں اپنے اوپر طنز کرنے کی جرأت بخشتے تھے —

اب وہ دروازہ بند ہو چکا ہے — موت نے اس دروازے پر زنجیر ڈال دی ہے اور کوئی اس دروازے کے راستے سے اندر داخل نہ ہو سکے گا۔

انسان بھی ایک گھر کی طرح ہوتا ہے جو سر پر چھت فراہم کرتا ہے جو زندگی کی تمام آسائشوں کی آماجگاہ ہوتا ہے اور جب انسان ابن انشا سا ہو تو پھر ان کے گھر ان کے دل — اتنے وسیع اور اتنے فراخ ہوتے ہیں کہ ان گنت لوگوں کے لیے پناہ گاہ بن جاتے ہیں۔

ابن انشا کے لیے ملک بھر میں بہت دعائیں مانگی گئی تھیں۔ جانے کتنے انسانوں نے رب ذوالجلال کے آگے ابن انشا کی صحت اور زندگی کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوں گے لیکن ابن انشا کا وقت آ چکا تھا۔ ہونی کو کون روک سکتا ہے اور موت کا ایک دن معین ہے اور اس کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ ابن انشا کے لیے جو دعائیں کی گئیں وہ رائیگاں نہیں گئیں۔ کیونکہ دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور وہ کسی اور رخ سے کسی اور جہت سے انسان کے کام آ جاتی ہیں —

انشا جی بہت بڑے شاعر تھے — بہت بڑے سفرنامہ نگار اور کالم نگار تھے۔ اور بہت بڑے انسان تھے —

انہوں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، جس کی بقول ان کے کوئی علمی روایت نہ تھی۔ لیکن ابن انشا نے نہ صرف یہ کہ علم حاصل کیا — علم تخلیق کیا — بلکہ کتابوں کے عاشق بن گئے۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی کتابیں تھیں۔ وہ کتابوں کے [illegible]

شمسے نے تعلق رکھتے تھے کتاب ان کے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت تھی سب سے بڑی مسرت تھی۔

ابن انشاء کا ایک رُخ تو یہ تھا کہ وہ کتابوں کے عاشق تھے اور دوسرا رُخ وہ ہے، جس کے بارے میں جناب احمد ندیم قاسمی نے کہا ہے کہ وہ تعلقات نبھانے میں یکتا تھے۔ وہ دوستوں کے مخلص دوست تھے — آج سوچتا ہوں کہ ان کے قریبی دوستوں میں سے اشفاق احمد، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، حمید اختر، عالی، ساحر لدھیانوی وغیرہ کے دل پر ان کی موت کی وجہ سے کیا بیتی ہوگی — یہ تو ہوئی خاص ذاتی تعلقات کی بات — حقیقت یہ ہے کہ ابن انشاء ہر شخص سے محبت سے ملتے تھے — ہم جیسے ان کے مقابلے میں ہر طرح سے چھوٹے تھے۔ ان کا بھی احترام کرتے تھے اور محبت کرتے تھے۔ دوسروں کی تکلیف محسوس کر کے رنجور ہو جاتے تھے اور ان کے بارے میں بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے انسان تھے جن کے ہاتھوں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

لیکن ان کی موت نے ہم سب کو نقصان پہنچایا ہے۔ ابن انشاء ایسے نہ تھے کہ کسی کو نقصان پہنچاتے لیکن اب بھی جو نقصان ان کی موت کی وجہ سے ہوا ہے اس میں بھی وہ بے قصور تھے، مجبور تھے — اب ان جیسا شاعر، کالم نگار، سفر نامہ نگار اور انسان ہم کہاں سے لائیں گے —

دنیا ان لوگوں سے تیزی سے خالی ہوتی جا رہی ہے جو انسانوں کو مسرتیں فراہم کرتے تھے۔ جو انسانوں کو جینا سکھاتے تھے — ابراہیم جلیس مرحوم سے ایک انٹرویو میں پوچھا گیا تھا کہ انہیں غیر ملکی ادیبوں میں سے کون سا ادیب پسند ہے تو ابراہیم جلیس نے بے ساختہ جواب دیا تھا — "ابن انشاء" اور ان کے غیر ملکی ہونے کا ثبوت اس طرح فراہم کیا تھا کہ ابن انشاء اپنے ملک میں کم ہی ٹھہرتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں زیادہ قیام کرتے ہیں — اب یہ بات کہنے والا ابراہیم جلیس بھی اللہ کو پیارا ہو چکا ہے اور ابن انشاء

بھی سدا کے لیے غیر ملک چلے گئے ہیں۔ اب وہ مختصر سے عرصے کے لیے بھی واپس نہ آ سکیں گے۔ اب کوئی ہمیں ایسے سفرنامے نہ سنا سکے گا جو ہر انداز میں منفرد ہوتے تھے۔ کوئی ایسا کالم نہ لکھے گا جس کا ایک اپنا انداز اور اسلوب تھا اور کوئی جوگ بجوگ کی شاعری نہ کر سکے گا کہ اب جدائیاں ہی جدائیاں ہیں۔ بجوگ ہی سے جوگ ختم ہوا۔

اب کوئی "بغداد کی ایک رات"۔۔ "سنگھائی"۔۔ "منافات"۔۔ "امن کا آخری دن" اور "دیوارِ گریہ" جیسی نظمیں نہ کہہ سکے گا۔۔ اب کوئی ایسی غزلیں نہ کہے گا جو چاند (؟) کے نور سے منور اور چاند کے ٹھنڈے کرب سے مملو ہوتی تھیں۔ اب کوئی بنجارہ نہ آئے گا اب کسی کے لیے کوئی ایسا عشق نہ کر سکے گا جو انسان کو تپا انسان بنا دیتا ہے۔۔ وہ دروازہ بند ہو چکا ہے۔

اب کوئی ایڈ گرایلن پو اور نہری وغیرہ کو اردو میں خوب صورتی سے منتقل نہ کر سکے گا۔ اب کوئی اردو کی آخری کتاب نہ لکھے گا اور طنز کی دنیا میں ایک ایسا انمٹ نقوش نہ چھوڑے گا کہ جو اپنے اسلوب کا شہکار ہو۔۔ اب کوئی "چلتا ہو تو چین کو چلیے"۔۔ "دنیا گول ہے"۔۔ "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" نہ لکھے گا۔۔ اب ابن انشاء اس عالم کا سفرنامہ ہمیں لکھ کر نہ بھیجیں گے جہاں وہ اب جا چکے ہیں۔۔ وہ اپنی نئی زندگی کے [illegible] ہیں کچھ نہ لکھ سکیں گے کہ کوئی ایسا کرنے پر قادر نہیں اور اس دنیا میں انہیں جو نہ ملی تھی، وہ ختم ہو چکی۔۔

عمر کی نقدی ختم ہوئی۔۔۔ اب ابن انشاء دوسرے حوالے سے زندہ رہیں گے۔ ان کی یاد میں ان کے غم میں کس کس کی آنکھ نے آنسو بہائے نہ ہوں گے اور کس کس کا دل ملول نہ ہوا ہو گا۔

پاکستان ٹی وی کراچی سے ان کی یاد میں ایک پروگرام اس موقع پر دکھایا گیا اس میں فیض صاحب، قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، انتظار حسین اور [illegible] نے حصہ لیا اور

پھر اس انٹرویو کا بھی کچھ حصہ دکھایا جو مصلح الدین نے لندن میں ستمبر ۱۹۷۷ کو ریکارڈ کیا
تھا — ابن انشا اپنی نظمیں غزلیں سنا رہے تھے۔ جب یہ پروگرام ریکارڈ ہوا تو ان کی
صحت ایک گونہ بحال ہو چکی تھی — پھر راحت کاظمی نے ان کی نظمیں غزلیں پڑھ کر سنائیں اور
امانت علی اور شاذیہ نے ان کا کلام گا کر سنایا — قوی نے ان کی نثری کتابوں کے
ٹکڑے پڑھے اور آغا ناصر نے ان کی آخری نظموں میں سے ایک :

"جب عمر کی نقدی ختم ہوئی —"

پڑھ کر سنائی ۔

قدرت اللہ شہاب کہہ رہے تھے "اندر سے وہ تنہا آدمی تھا۔ تنہا اور ایک اچھی
بات ممتاز مفتی نے کہی — فیض صاحب ابن انشا کی شاعری اور نثر کی تعریف کر
رہے تھے — جمیل الدین عالی دکھ میں بھیگے ہوئے لہجے میں بول رہے تھے۔ انتظار حسین ان
کی نثر کے کلاسیکی ذائقے کا ذکر کر رہے تھے۔ ابن انشا کو اس عہد کا صاحب طرز نثر نگار
قرار دے رہے تھے۔ آنے والے دنوں اور برسوں میں ان پر بہت کچھ لکھا جائے گا —
کہا جائے گا — ابن انشا زندہ رہیں گے، اگرچہ زندگی کے دروازے پر زنجیر پڑ چکی ہے
لیکن ابن انشا کی آواز سنائی دیتی رہے گی ۔

ابراہیم جلیس

ابراہیم جلیس کا آخری قہقہہ بہت خوف ناک اور دہشت ناک ہے — اس کی "آخری مسکراہٹ" مدتوں تک ہمیں رلاتی رہے گی — اذیت میں مبتلا رکھے گی اور جب کبھی اس ملک کی صحافت کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس کی موت کا واقعہ لکھتے ہوئے مؤرخ کا قلم رک جائے گا اور وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گا —

ابراہیم جلیس نے بہت قہقہے لگائے — وہ زندگی بھر ہنستا اور ہنساتا رہا — جس محفل میں وہ ہوتا، اس محفل میں اس کا قہقہہ سب سے اونچا ہوتا۔ وہ گھپوڑ اور ہنسوڑ تھا۔ جہاں وہ جاتا اپنے ساتھ بلند آہنگ قہقہے لے جاتا — اس کی زندگی میں قہقہے ہی قہقہے تھے، کیونکہ وہ بے حد دکھی تھا — وہ بے حد حساس تھا — وہ کتنا حساس تھا، اس کا اندازہ تو اس کی موت سے ہی لگایا جا سکتا ہے اور مجھے مرتے وقت اس کے اندر جو قہقہہ پیدا ہوا ہوگا، وہ کتنا خوف ناک اور زہریلا ہوگا کہ اس کی رُوح کو جسم کی قید سے آزادی مل گئی — آج اس کی روح ہر چیز، ہر اختیار سے آزاد ہے — اب اس پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا —

اپنے بلند آہنگ قہقہوں کے ذریعے ابراہیم جلیس نے ہر پابندی کا مذاق اُڑایا تھا — وہ اسی لیے ہنستا اور ہنساتا تھا کہ وہ ہر طرح کے جبر اور پابندیوں کو ختم کر دینا چاہتا تھا — اس کا ذہن، اس کا دماغ . . . اس کا پورا وجود آزادی کا خواہاں تھا۔ ایسی

آزادی جو معاشی خوش حالی اور انسانی احترام سے عبارت ہوتی ہے۔ اس آزادی کے لیے وہ ساری عمر سرگرم رہا۔۔۔ جدوجہد کرتا رہا اور اسی جدوجہد میں وہ مرگیا۔
اور آج وہ مرگیا ہے تو ہم جو اس کی موت کی معنویت پر غور کریں گے تو ایک ایسی اذیت کا شکار ہو جائیں گے جس اذیت کو ابراہیم جلیس ساری عمر برداشت کرتا رہا تھا۔

آپ اس سے کبھی ملے ہیں؟ نہیں ۔۔۔ اس کے لاکھوں قارئین نے اس کو کبھی نہ دیکھا ہوگا ۔۔۔ اس کی تصویر اس کے وجود اور اس کی شخصیت کو کبھی پوری طرح پیش نہیں کرسکتی ۔۔۔ آپ لے اس کی تحریریں پڑھی ہیں، اس کی باتیں نہیں سُنیں ۔۔۔ اس کے لطیفے اور قہقہے نہیں سُنے ۔۔۔ اس انسان سے نہیں ملے جو قہقہے لگاتا تھا۔ ہر دُکھ کو قہقہے میں چھپا لیتا تھا۔

ابراہیم جلیس کا قد چھ فٹ سے اوپر نکلتا تھا ۔۔۔ بڑی بڑی ذہین اور چمکدار آنکھیں، بڑے بڑے ہونٹ، رنگت خاصی سانولی۔ اچھا خاصا افریقی نظر آتا تھا۔ لیکن جب وہ قہقہہ لگاتا تو اس کا چہرہ ایک نقاب الٹ دیتا ۔۔۔ وہ اگر کبھی سنجیدگی اختیار کرتا تو بڑا ہی مدبر نظر آتا ۔۔۔ لیکن وہ اتنا دکھی تھا کہ کبھی سنجیدہ نہ ہو سکا۔

لاہور میں بڑی گہما گہمی تھی ۔۔۔ ان دنوں سارے راستے لاہور کی طرف آتے تھے ۔۔۔ لاہور میں اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہو رہی تھی ۔۔۔ یہ ایک یادگار تاریخی واقعہ ہے جس کا اعزاز لاہور اور پیپلز پارٹی کی حکومت کو ملتا ہے۔ ابراہیم جلیس ان دنوں لاہور میں تھا۔ وہ ان پاکستانی صحافیوں میں سے تھا جو اسلامی سربراہی کانفرنس کی رپورٹنگ کے لیے چُنے گئے تھے ۔۔۔ ابراہیم جلیس سے ان دنوں ملاقات ہوئی ۔۔۔ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد والے ابراہیم جلیس نے ٹوپی پہن رکھی تھی ۔۔۔ یوں بالا قامتی میں اور بھی اضافہ ہوگیا ۔۔۔ اس نے اپنے بلند بانگ قہقہوں

کے درمیان بتایا، وہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور اسمبلی ہال کی طرف چلا۔ جب وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ پروٹوکول کا سٹاف اس کے آگے پیچھے ادب سے چل رہا ہے ۔ اس کی قد و قامت اور رنگت سے وہ اسے کسی افریقی اسلامی ملک کا نمائندہ سمجھے تھے۔ ابراہیم جلیس نے بلند قہقہہ لگایا اور کہا: میں نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی ۔ وہ لوگ مجھے ادب و احترام سے لیے آگے بڑھنے گئے ۔۔۔ پھر ہال کے اندرونی حصے میں پہنچ کر ایک اعلیٰ افسر نے پوچھا:

"سر آپ کس ملک سے تعلق رکھتے ہیں؟"

ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگایا: "پرسیس سے ....."

ابراہیم جلیس نے دوسرا زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا:

"اس افسر کی حالت دیدنی تھی۔ وہ مجھے دل ہی دل میں کوس رہا ہوگا کہ اس صحافی نے کیسا بے وقوف بنایا ہے"

مجھے ابراہیم جلیس کے سینکڑوں تیز طرار جملے اور لطیفے یاد آ رہے ہیں، لیکن میں انہیں نہ دہراؤں گا ۔ ان محفلوں اور محبتوں کی یادیں دہرانے کا حق تو ان لوگوں کو ہے جو اس کے بالکل قریب تھے، جو اس کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے اور اس کی موت کی خبر سن کر جانے کتنا روئے ہوں گے، کتنا دکھی ہوں گے ۔ ابراہیم جلیس کے لطیفے اور جملے تو لوئی، حمید اختر، موجد آرٹسٹ، ابن انشاء، الیاس رشیدی اور احمد راہی کو تڑپا رہے ہوں گے کہ وہ کتنا پیارا دوست اور ساتھی تھا اور اس کی یادیں انہیں رلا رہی ہوں گی ۔

مجھے تو اس ابراہیم جلیس کا چہرہ ۔ قہقہہ لگاتا ہوا چہرہ یاد آ رہا ہے جو دکھی تھا۔

ابراہیم جلیس — اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اردو ادب کی سب سے اہم اور تاریخ ساز تحریک انجمن ترقی پسند مصنفین کے وہ سینئر ارکان میں سے ایک تھا — حیدرآباد دکن میں وہ پیدا ہوا اور وہیں اس نے قلم سنبھالا۔ اس نے اپنی تمام صلاحیتیں اور ہمدردیاں مظلوم طبقے کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ انہی دکھوں کی کہانیاں وہ لکھتا تھا — جب حیدرآباد دکن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہوئی تو وہ انتظامات میں پیش پیش تھا — کرشن چندر نے اپنے لازوال رپورتاژ "پودے" میں اس کا اور ابراہیم جلیس کے بھائی کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے کتنے ایثار سے کام کیا تھا —

اس دور میں قحط بنگال کا المناک واقعہ پیش آیا، جس پر ہر ادیب نے آنسو بہانے اور ابراہیم جلیس کا قلم کچھ اور بھی آنسو بہانے لگا — اس دور میں اس نے "بھوکا ہے بنگال" مرتب کی۔ "ہم کروڑ بھکاری" لکھا۔ اور "چور بازار" جیسا ناول لکھا جو اس دور کے نوجوانوں کی زندگیوں، امنگوں اور مایوسیوں کا آئینہ ہے —

ابراہیم جلیس نے مجھے کہا تھا "وہ دور کیا دور تھا۔ اب لکھنے کی وہ امنگ نہیں رہی۔ تمہیں نہ جانے یہ سب کچھ لکھے اور لکھنے — لوگ تو افسانہ نگار، ناول نویس ابراہیم جلیس کو بھول گئے ہیں —

یہ ابراہیم جلیس کا عجز تھا: ورنہ اُسے بطور افسانہ نگار، ناول نگار کبھی بھلایا نہیں جا سکتا — انسانوں کے دکھوں کو جس سادہ انداز میں اس نے کہانیوں اور ناولوں کا روپ بخشا، اس سادگی کی تاثیر دل سے مٹ نہیں سکتی —

پھر ابراہیم جلیس کی زندگی میں وہ دور آیا جب بھارتی توسیع پسندی نے حیدرآباد دکن کو ہڑپ کر لیا — اس وقت ابراہیم جلیس نے بھارت کے خلاف دن رات تقریریں کیں۔ ریڈیو کو ایک مورچہ بنا دیا، لیکن بھارتی جارحیت کامیاب

رہی اور ابراہیم جلیس کو ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔
پاکستان میں اس پر کیا بیتی ؟ اس کی تصویر تو اس کی دو کتابوں میں بطور خاص ملتی ہے — ایک اس کا معرکتہ الآراء رپورتاژ " دو ملک ایک کہانی " ہے اور دوسری " جیل کے دن جیل کی راتیں " غربت، بدحالی اور بے کاری کے شکار ابراہیم جلیس کو کئی سرکاری ملازمتوں کی آفر ہوئی — سرکاری پرچے " ماہ نو " کی ادارت کا لالچ دیا گیا تھا۔ لیکن وہ عوام کی جنگ اور جدوجہد میں شریک تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے دُور پاکستان میں تنگی اور غربت کے دن گزارتا رہا۔ " نقاد " کراچی جیسے پرچے میں لکھتا رہا — قلم سے روٹی کماتا رہا اور پھر حکومتِ وقت نے اس کی تحریروں سے ناخوش ہو کر اُسے قید کر لیا — " جیل کے دن جیل کی راتیں " انھی ایام کی کہانی ہے جو قید میں بیتے تھے —
ابراہیم جلیس نے دکھ دیکھے اور دکھ سہے تھے — اور دکھوں کا نشان دنیا سے مٹا دینا چاہتا تھا — اس لیے اس نے طنزیہ مضامین لکھنے شروع کیے — اس کے ان مضامین کے کئی مجموعے کتابی صورت میں شائع ہوئے — جن میں " ممنوعہ لٹریچر اور " پبلک سیفٹی ریزر " خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں —
ابراہیم جلیس ایک مقبول ترین طنز نگار کی حیثیت سے سب پر چھا گیا — " جنگ " میں چھپنے والا اس کا کالم " وغیرہ وغیرہ " مقبول ترین کالم سمجھا جاتا تھا۔
ابراہیم جلیس کو چند برسوں کے بعد " جنگ " بھی چھوڑنا پڑا — وہ " انجام " کا ایڈیٹر ہوا — اور پھر " انجام " بند ہو گیا — اپنی ضرورتوں کے لیے وہ لکھتا رہا — اچھا بُرا — اور پھر وہ فلم کی دنیا میں نکل گیا — یہاں اس نے کچی کلیاں — جائیداد — (مکالمے ریاض شاہد کے لکھے ہوئے تھے) سویرا — احساس اور تہذیب کی کہانیاں لکھیں — " عوامی عدالت " کا اجراء کیا اور اب وہ " مساوات " کراچی کا ایڈیٹر تھا کر

موت نے اُسے آلیا —

اس نے جدوجہد سے بھرپور ایک زندگی گزاری - اس کی زندگی کا نصب العین واضح تھا — وہ بنی نوع انسان کی خوشحالی کی جدوجہد میں شریک تھا — ظلم، استحصال اور غلامی کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کا سپاہی تھا — اس نے دنیا میں دکھ ہی دکھ دیکھے تھے اور ان دکھوں کو حقیقتوں میں سمیٹ لیا تھا — اور بقول احمد راہی "اس کے قہقہے وٹامن سے خالی اور کبھی کبھی بڑے کھوکھلے ہوتے تھے —"

طنزیہ اور مزاحیہ کالم لکھنے والا — ان تھک قہقہے لگانے والا یہ شخص دل کا مریض تھا - ایک بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا اور وہ اس سے بچ نکلا تھا لیکن جب مساوات کراچی کو ایک حکم کے تحت بند کر دیا گیا اور اس کی اشاعت التوا میں پڑ گئی تو ابراہیم جلیس اپنے ساتھیوں کے روزگار اور بے کاری کے دکھ میں گھر گیا — یہ وار کاری تھا — اس نے بڑے بڑے کاری وار سہے تھے لیکن یہ وار وہ نہ سہہ سکا اور اس حساس ترین انسان کے دماغ کی شریان پھٹ گئی —

ہاں ایسے انسان کے ساتھ اس معاشرے میں یہی ہونا چاہیے تھا — ہم اس کو اس سے بڑا صلہ کیا دے سکتے تھے —

آیئے، اس کی موت پر اسی کی طرح قہقہہ لگائیں اور پھر ان اذیتوں کو محسوس کریں، جن کو وہ ساری عمر برداشت کرتا رہا — اور اگر ہم ان اذیتوں کا عشر عشیر بھی برداشت کریں تو ہم اس جبر اور ظلم کے خلاف سچے دل سے اٹھ کھڑے ہوں گے، جس کے خلاف ابراہیم جلیس ساری عمر جنگ لڑتا رہا — ہنستے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے — اس نے یہ جنگ اپنی زندگی کے آخری سانس تک لڑی — ظلم، انسانی جبر اور انسانی بدحالی کے خلاف — قلم

سے جنگ لڑنے والے ایسے سپاہی کی موت ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہے۔
ززبسم آتبیس کا آخری قہقہہ بڑا خوف ناک ہے!

چارلی چپلن

۱۹۵۲ء سے ۱۹۰۰ء تک پوری ربع صدی کا فاصلہ ہے۔ اس عرصے میں چارلی چپلن نے صرف دو فلمیں بنائی تھیں اور ان میں سے ایک فلم "کونٹس فرام ہانگ کانگ" کے ساتھ یہ لطیفہ بھی ہوا کہ امریکہ میں اس فلم کی نمائش، فلم کی تکمیل اور نمائش کے تقریباً بیس برس بعد ممکن ہو سکی — کیونکہ امریکی حکام کو یہ پسند نہ تھا کہ چارلی چپلن کی فلم کی نمائش امریکہ میں ہو۔ بہر حال اس ربع صدی میں دو فلمیں بنیں جو چارلی چپلن کے مخصوص مزاج سے بہت مختلف تھیں — ۲۵ برس کا عرصہ بڑا طویل ہوتا ہے — اس عرصے میں تو لوگ بڑے بڑے فنکاروں کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے ہیں اور پھر شو بزنس میں تو صورتِ حال اور بھی زیادہ مشکوک اور غیر یقینی ہے — ایک شخص جو عالمگیر شہرت کا مالک ہوتا ہے جب کسی وجہ سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اسے یکسر نظر انداز نہ بھی کیا جائے تو اسے بڑی حد تک بھلا دیا جاتا ہے۔

لیکن اس عرصے میں جب بھی چارلی چپلن نے ۲۰ برس میں صرف دو فلمیں بنائیں اس کا نام گونجتا رہا — اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا — اس کے فن پر بہت کچھ لکھا جاتا رہا اور وہ دنیا کا محبوب ترین فن کار سمجھا جاتا رہا — اس کی شہرت اور ہر دلعزیزی اور کشش میں کوئی کمی نہ ہوئی اور چارلی چپلن کا فن — ساری دنیا میں سراہا جاتا —

اور اب — جب ۱۹۰۰ء کے کرسمس کے دن ۲۵ دسمبر کو چارلی چپلن کا وجود اس دنیا سے اٹھ گیا ہے تو اس وقت بھی ہر وہ شخص جو چارلی چپلن کی عظمت سے

واقف ہے۔ جانتا ہے کہ چارلی چپلن اپنی موت کے بعد بھی زندہ رہے گا۔ وہ ان لوگوں میں شامل ہو چکا ہے جو اپنی زندگی ہی میں دوام حاصل کر لیتے ہیں اور موت کا نقاب بھی اوڑھ لیں تو ان کا چہرہ چھپتا نہیں، بلکہ ہمیشہ سامنے رہتا ہے۔

چارلی چپلن کی موت سے بلاشبہ دنیا ایک ایسے شخص سے محروم ہو گئی جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

موت ہر شخص کا مقدر ہے۔ اس سے کسی کو نجات نہیں مل سکتی۔ جب کوئی شخص مرتا ہے تو افسوس ناک بات یہ ہوتی ہے کہ اس شخص کے ساتھ وابستہ بہتری اور خلاقی کے جو امکانات وابستہ ہوتے ہیں، وہ بھی ختم ہو جاتے ہیں اور جب مرنے والا چارلی چپلن جیسا شخص ہو تو پھر صدمہ اور نقصان بے اندازہ ہوتا ہے۔

چارلی چپلن نے لمبی عمر پائی ۔ بارہ برس کم ایک صدی ۔ یعنی وہ ۸۸ برس جیا۔ اور جب ہم اس کی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ ساری عمر فن کی خدمت کرتا رہا۔ وہ ۵ برس کا تھا جب پہلی بار اسٹیج پر آیا اور پھر اپنی زندگی کے ۸۳ برس اس نے فن کی خدمت کرتے ہوئے گزارے۔ یہ اپنی جگہ ایک بڑی اہم بات ہے اور ایسی مثالیں دنیا میں کم ہی ملتی ہیں کہ کوئی شخص اتنا لمبا عرصہ کسی تخلیقی شعبے کے ساتھ منسلک رہا ہو اور اس کے تخلیقی کارناموں کی نہ صرف یہ کہ فہرست طویل ہو بلکہ اس نے ایک آورش زندگی بھی گزاری ہو اور ایسے نقوش چھوڑے ہوں جو ابدیت سے ہمکنار ہو چکے ہوں۔

چارلی چپلن کی عظمت کا راز اس کی سماجی اور معاشرتی طنز میں پوشیدہ ہے۔ چارلی چپلن ہمیں ہنساتا بھی ہے، لیکن وہ ہمیں جو قہقہہ عطا کرتا ہے، وہ آنسوؤں میں بھیگا ہوتا ہے۔ اس قہقہے میں بے پناہ طنز ہوتا ہے۔

وہ ناہموار انسانی معاشروں پر اس طرح سے ہنستا ہے کہ قہقہہ زہرخند بن جاتا ہے۔ دنیائے علم و فن میں یہ کارنامہ بہت بڑا سمجھا جاتا ہے اور چارلی چپلن ساری عمر ایسا ہی کارنامہ

سرانجام دیتا رہا — اس نے بڑا نام کمایا، بڑی دولت کمائی — لیکن وہ اپنے بچپن، لڑکپن اور اوائل شباب کا زمانہ کبھی نہ بھول سکا — غربت اور افلاس کا یہ دور اس کا معلم ثابت ہوا تھا — اس دور نے اسے بہت کچھ سکھایا — انسانوں سے محبت کرنا، بے انصافی سے نفرت کرنا، ظلم اور آمریت کے خلاف آواز بلند کرنا، ہر ایسے عمل اور فعل کی مذمت کرنا جو انسانوں کے خلاف ہو، جو انسانوں کی تحقیر کرتا ہو — جس سے احترام آدمیت کو دھچکا لگتا ہو —

چارلی چپلن نے اپنی خودنوشت میں لکھا تھا :

"میں دنیا کے ہر انسان کے کام آنا چاہتا ہوں، خواہ وہ گورا ہو یا کالا — انسانوں میں ہوس زر کی وجہ سے ظلم و شقاوت کے جذبات توانا ہو گئے ہیں، جنہوں نے پوری بنی نوع انسان کو متاثر کیا ہے — پیسے کی ہوس نے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ بے انصافی کرنے پر اکسایا ہے — سرمایہ دارانہ نظام کوڑھ کی طرح ہے جو متعدی ہوتا ہے اور پھیلتا ہی چلا جاتا ہے — ہمارے عہد کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسانوں کو مشین کا غلام بنا دیا گیا ہے — اور انسان سے اس کی روح چھینی جا رہی ہے اور میں اس رویے کے خلاف احتجاج کرتا ہوں اور ہمیشہ انسانوں کے ساتھ کی جانے والی بے انصافیوں کے خلاف احتجاج کرتا رہوں گا۔"

چارلی چپلن ایک جینیئس تھا — اس کا قد خاصہ 'نارمل' تھا لیکن اپنی فلموں میں وہ پستہ قامت نظر آتا ہے — عجیب سا ہیٹ اور کوٹ اور پتلون اور بوٹ پہنے ہوئے وہ سامنے آتا تھا — یہ لباس اس کے ساتھ مخصوص ہو چکا تھا اور پھر وہ اس خاص بہروپ میں عجیب سی مونچھیں لگائے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے ہمارے سامنے کھڑا ہو کر ہمیں ہمارے ہی عیبوں، ہماری ہی زیادتیوں پر ہنستا ہوا غائب ہو جاتا تھا —

اور اب وہ ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے۔

آئیے چارلی چیپلن کی زندگی پر ایک مختصر نظر ڈالیں۔

چارلی چیپلن ۱۸۰۹ء میں انگلستان میں پیدا ہوا۔ غربت اور افلاس کی گود میں آنکھ کھولی۔ کم عمری ہی میں فطری صلاحیتیں اپنا اظہار چاہتی تھیں۔ پھر پیٹ کے تقاضے بھی تھے۔ چارلی چیپلن ۵ برس کا تھا کہ وہ سٹیج پر آیا اور کافی عرصے تک وہ سٹیج پر اداکاری کرتا رہا۔ اس زمانے میں خاموش فلمیں بنا کرتی تھیں اور اس نئے ذریعۂ اظہار نے اپنے پاؤں جمانے شروع کر دیے تھے۔ چارلی چیپلن نے بھی اس ذریعۂ اظہار کو اپنانے اور جذبات کی ترجمانی کے لیے چنا اور امریکہ کا رُخ کیا۔ وہاں پہلے ــ وہ دوسرے سٹوڈیوز کے لیے فلمیں بنانے لگے۔

اس ابتدائی دور میں گویا وہ اپنا آپ ہی تلاش کرتا رہا۔ ۱۹۱۴ء میں چارلی چیپلن نے اپنی ذاتی فلمیں بنانا شروع کیں اور اس میں ان کی ایک فلم خاصی مقبول ہوئی۔

۱۹۱۵ء کا سن عالمی فلمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہ برس ہے جب سینما کے عالمی ناظرین کے سامنے "چیپلن کردار" سامنے آ رہے۔ وہ ہیئت کذائی اور پہناوا جو بعد میں چارلی چیپلن کا ٹریڈ مارک بن گیا۔ وہ ۱۹۱۴ء میں پہلی بار سامنے آیا۔ اس دور میں چارلی چیپلن کی دو فلموں "واٹر پیپ" اور "دی بینک" نے بڑی شہرت حاصل کی اور چارلی چیپلن کا مخصوص کردار اپنی چھاپ گہری کرنے میں نمایاں طور پر کامیاب ہو گیا۔

۱۹۱۹ء میں چارلی چیپلن نے اپنے زمانے کے مشہور فن کاروں ڈی۔ ڈبلیو۔ گرفتھ، ڈگلس فیئربینکس اور میری پکفورڈ کے اشتراک سے ایک ادارہ "یونائیٹڈ آرٹسٹس" قائم کیا جو اب بھی موجود ہے۔ اس دور میں چارلی چیپلن اور میری پکفورڈ کا معاشقہ بھی خوب مشہور ہوا۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت چارلی چیپلن کی فلم "گولڈ رش" کو حاصل ہوئی۔ سونے کی تلاش میں سرگرداں مہم جوؤں میں ــ چارلی چیپلن بھی شریک ہوا اور اس فلم میں چارلی نے جلب زر پردہ

طنز کیا کہ جس کا جواب نہیں — جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ منظر کبھی نہیں بھلا سکتے۔ جب چارلی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ہی جوتوں کے تسمے اُبال کر کھاتا ہے۔

اس کے بعد چارلی چیپلن کی دو فلموں سٹی لائٹس (۱۹۳۱ء) اور ماڈرن ٹائمز (۱۹۳۶ء) نے بڑی شہرت حاصل کی — یہ سب فلمیں خاموش تھیں۔

اور پھر ۱۹۴۰ء کا سن بھی عالمی سینما کے لیے اہم سن کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا — چارلی چیپلن کی مشہور زمانہ فلم "دی گریٹ ڈکٹیٹر" اس برس نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ یہاں چارلی چیپلن دنیا کے ہر ڈکٹیٹر سے ملواتا ہے۔ ہٹلر پر اس فلم میں جو طنز کی گئی — دراصل وہ دنیا کے ہر ڈکٹیٹر پر طنز کی حیثیت رکھتی ہے — خواہ اس کی مونچھیں ہٹلر کی طرح بڑی ہوں یا چھوٹی۔

آمریت کتنی سفاک، خوفناک، انسان کش ہونے کے ساتھ ساتھ کتنی قابلِ نفرت اور مضحکہ خیز ہوتی ہے — اسے چارلی چیپلن نے پیش کیا۔ اس فلم پر کئی ملکوں میں پابندی لگا دی گئی۔ نازی جرمنی میں تو بڑا شدید ردِعمل ہوا تھا۔ ویسے آج بھی یہ فلم دیکھی جائے تو دنیا بھر کے ہر طرح کے ڈکٹیٹروں کی صحیح صورت دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۹۴۷ء کا برس عالمی سینما کے ناظرین کے لیے "موسیو ورڈو" کو لاتا ہے۔ اس فلم میں چارلی چیپلن نے اپنا مخصوص پہناوا ترک کر دیا۔ "موسیو ورڈو" سرمایہ دارانہ نظام پر طنز ہے۔ اس فلم نے امریکہ میں خوب تہلکہ مچایا۔ بھلا اپنی کریہہ صورت آئینے میں دیکھنا کون پسند کرتا ہے۔ امریکہ کے سرمایہ دار بھنا اٹھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں چارلی چیپلن کی فلم "لائم لائٹ" کی نمائش شروع ہوئی — اس فلم کی نمائش کے سلسلہ میں چارلی چیپلن برطانیہ جا رہے تھے کہ امریکی حکومت نے ان کا ویزا ضبط کر لیا اور امریکی حکمرانوں نے فیصلہ کیا کہ چارلی چیپلن اب امریکہ نہ آ سکے۔

یہ مزے کی بات ہے کہ چارلی چیپلن نے اپنی عمر کا سب سے بڑا حصہ امریکہ میں گزار

اور کبھی امریکہ کی شہریت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی' وہ امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت کرتا تھا۔

"لائم لائٹ" کی نمائش برطانیہ میں ہوئی تو اس کا افتتاح برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ نے کیا۔ یورپ کے کئی ملکوں نے انہیں شہریت کی پیش کش کی' لیکن چارلی چپلن نے سوئٹزرلینڈ کا رُخ کیا۔ وہ عالمی شہری تھا۔ ہر انسان کے ساتھ جیتا تھا۔ اس لیے وہ ایک غیر جانبدار ملک میں رہتا رہا۔

امریکہ میں نام نہاد امریکن دشمن سرگرمیوں کے خلاف محاسبہ کرنے والے سینٹر میکارتھی جیسے لوگ چارلی چپلن کی انسان دوستی' راست گوئی اور حق پسندی سے مخالف تھے اور چارلی چپلن کو اشتراکی قرار دے چکے تھے؛ حالانکہ نظریات وعقاید کے اعتبار سے چارلی چپلن انسان دوست تھا اور ناہموار سماجی حالات اور بے انصافیوں کا عظیم ترین ناقد تھا۔

امریکہ چھوڑنے کے بعد چارلی چپلن نے صرف دو فلمیں بنائیں۔ وہ ایک سچے اور بڑے فن کار کی طرح اپنی فلموں پر محنت کرتا تھا۔ وہ نہ صرف فلم میں مرکزی کردار ادا کرتا' بلکہ فلم کو پروڈیوس بھی خود ہی کرتا اور ڈائریکٹر بھی خود ہی ہوتا۔ اس کے علاوہ چارلی چپلن نے اپنی ہر فلم خود لکھی اور ہر فلم کا میوزک بھی خود ہی ترتیب دیا۔ وہ فلم سازی کے ہر شعبے پر حاوی تھا۔

چارلی چپلن ہنساتا ہے۔ اس ہنسی کے پیچھے عمیق انسانی کرب چھپا ہوا ہے۔ اس کی عظمت کا راز ان کے عجیب وغریب لباس اور حلیے میں نہ تھا' بلکہ اس طنز میں تھا جو وہ کرتے تھے۔ وہ سماج پر نہ صرف خود قہقہہ لگاتا ہے بلکہ ہمیں بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اپنی اسی طنز کی وجہ سے وہ سرمایہ دار دنیا میں زیرِ عتاب ہے' لیکن وہ اس کی پرواہی کب کرتا ہے۔ ایک بڑے فن کار کی طرح وہ اٹل اور صادق رویے کا انسان تھا۔

چارلی چپلن کی عظمت کو اس طرح سے خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ مئی ۱۹۷۵ء میں

عالمی امن کونسل نے انہیں امن کا ایوارڈ دیا۔ اس اعزاز کے ساتھ انعام کی ایک خطیر رقم بھی ہوتی ہے ۔ چارلی چپلن نے اس رقم کو عالمی امن اور انسانی بھائی چارے کے فروغ کی راہ میں خرچ کر دیا۔

چارلی چپلن نے اپنی خودنوشت میں لکھا تھا :

"سرمایہ دار دنیا میں کاروبار اور تجارت کا منطقی نتیجہ قتل ہوتا ہے اور انسان اس آہنی نظام میں کھلونا بن کر رہ جاتا ہے ۔"

چارلی چپلن انسان کو انسان کی صورت میں دیکھنا اور زندہ دیکھنے کے خواہاں تھے۔ وہ کسی نظام کو یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے کہ انسان کو کھلونا بنا دیا جائے۔ انہوں نے اپنی فلموں میں انسانی سماج کے بدنما اور قابلِ نفرت پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کیا کہ سماج کے کھوکھلے ڈھانچے پر ہر شخص قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ شخص، وہ فن کار جسے برطانیہ نے ۱۹۷۵ء میں اپنے سب سے بڑے خطاب "نائٹ ہڈ" یعنی سر سے نوازا تھا۔ وہ اپنے لیے سب سے بڑا اعزاز یہ سمجھتا تھا کہ انسان اس سے محبت کریں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں ۔ انسانی سماج کی ناہمواریاں ختم ہوں اور یہ جو انسانوں کے درمیان تفاوت ہے، اس کا نام و نشان مٹ جائے۔ وہ انسانوں کو برتر سمجھتا تھا، مشین کو نہیں۔

انہوں نے چھوٹی بڑی سینکڑوں خاموش اور ناطق فلمیں بنائیں اور انسانیت کا پرچار کرتا رہا ۔ اس پر بڑے الزام لگے، اس پر عتاب نازل کیے گئے، لیکن وہ کسی سے ہراساں نہ ہوا ۔ کیونکہ بڑا فن کار ۔ کسی حکومت کے ناجائز تسلط اور استبداد کو پسند نہیں کرتا اس کے سامنے سر خم نہیں کرتا بلکہ سر اونچا کر کے کھڑا ہوتا ہے۔

چارلی چپلن کی ایک فلم ایسی تھی جس میں وہ ایک ایسا مزدور دکھایا جاتا ہے جو ابھرے ہوئے کیل کانٹوں کو ٹھونکنے کے کام پر مامور ہے اور اس کام میں وہ اتنا محو

اور اس کا انداز عادی ہو جاتا ہے۔ جو چیز بھی ابھری ہوئی نظر آتی ہے وہ اس کو بے اختیار ٹھونکنے لگتا ہے اور اسی ٹھونکا ٹھانکی میں وہ ہر ابھری ہوئی چیز کو بھی ٹھونک کر رکھ دیتا ہے۔ خواہ ضرورت کی ہو یا فطری ہو۔

چارلی چیپلن نے اسی انداز میں طنز کا وار کیا اور پھر اعتدال کے فقدان کو نشانہ بنایا اور ان کی ایسی ہی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں کو سامنے لاتے ہوئے قہقہہ لگاتا اور گویا اس دور کا قہقہہ کبھی ماند نہیں پڑ سکتا۔

جب تک دنیا کے کسی خطے میں بھی کوئی آمر کوئی بے انصافی اور ناہمواری ہے، اس وقت تک اس کے طنز کا وار ضرب لگاتا رہے گا اور جب ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا جس میں کوئی ناہمواری نہ ہوگی تو پھر بھی اس کا فن زندہ رہے گا — ایک دور کی تاریخی دستاویز کی حیثیت سے .... اور یوں چارلی چیپلن کی ابدیت کبھی نہ دھندلائے گی۔

رشید جاوید

بہت دنوں سے ان سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔

چند دنوں سے وہ علیل تھے، پھر سُنا دل کا دورہ پڑ گیا ہے، پھر خبر ملی، اب طبیعت سنبھل رہی ہے۔ کل شام کے قریب ایک دوست نے کہا — تم نے سُنا، ان کا انتقال ہو گیا ہے — میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ پھر ان کی باتیں، ان کی یادیں ذہن پر یلغار کرنے لگیں — ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۵ء تک دس برس جو ان کے بہت قریب گزرے تھے، وہ سب یاد آنے لگے — جب میں یادوں کی یلغار سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو ایک دوست نے کہا، خبر بنا دو — میں نے کاغذ پر ان کا نام لکھا اور پھر قلم جیب میں ڈال لیا۔ اور دوست سے کہا۔ اس نام والے شخص کے مرنے کی خبر میں نہیں بنا سکتا۔ نیوز سیکشن کے کسی آدمی سے کہو وہ خبر بنا دے، مجھ سے اس شخص کی موت کی خبر نہیں بنے گی۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں لکھوں کہ رشید جاوید کا انتقال ہو گیا ہے —

بہت سال پہلے حلقہ دامِ خیال سے میں نے یہ کالم ممتاز میں شروع کیا تھا — اب یہ کالم امروز میں چھپ رہا ہے — وہ کالم جس کا آغاز رشید جاوید کے ممتاز میں ہوا۔ اس میں رشید جاوید کی موت کے حوالے سے کچھ لکھتے ہوئے میں اپنے آپ کو بے حد بے بس و مجبور پاتا ہوں — وہ کالم جو ممتاز میں شروع ہوا۔ اس حلقہ دامِ خیال میں میں رشید جاوید کی موت پر نہیں لکھ سکتا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار ممتاز میں میرا یہ کالم کچھ اس طرح سے چھپا کہ پیراگراف کاپی جوڑنے والے کی کوتاہی سے اوپر نیچے ہو گئے۔ انہوں نے میرے سامنے کاپی جوڑنے والے کو کہا۔ یہی کالم تو میں شوق سے پڑھتا ہوں — یہی پرچے کی اچھی چیز ہوتی ہے۔ تم نے اس کا ستیاناس کر دیا۔

وہ کالم جو انہیں پسند تھا۔ اس کالم میں ان کی موت کا ذکر کیسے لکھوں؟ کیسے لکھوں؟ ان کی محبت، ان کی شفقت کی وجہ سے "ممتاز" میرا پرچہ بن گیا تھا۔ جیسے میری ذات کا حصہ ہو کبھی بار ایسا ہوا کہ کسی بات پر اختلاف ہوا — میں ممتاز سے چلا آیا تو انہوں نے کہا — اب ہم ساتھ نہیں چل سکتے۔ لیکن انہوں نے میرے اپنے تعلقات کے حوالے سے ایک نئی روایت قائم کی — جب پہلی بار میں ممتاز سے خود آ گیا تو وہ مجھے لینے نیشنل بک سنٹر (اب اس کا نام نیشنل بک کونسل ہے) آئے اور کہا:

"بیٹے آوارہ گردی کے لیے گھر سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن باپ اسے گھر واپس لے آتے ہیں؛ تم بھی گھر واپس آ جاؤ۔"

یوں میں کئی بار آوارہ گردی کے لیے گھر سے باہر نکلا اور انہوں نے ہر بار مجھے گھر واپس بلا لیا اور ان کی اس روایت کو ان کے وہ بیٹے بھی اب تک نبھا رہے ہیں جن کے بارے میں یہ تصور کر کے میرا دل کانپ اٹھتا ہے — رشید جاوید کے انتقال سے ان پر کیا گزر رہی ہو گی؟

میں موت سے نہیں ڈرتا — میں نے اسے ایک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہے۔ میں نے اپنے عزیزوں اور پیاروں کے اتنے جنازے اٹھتے دیکھے ہیں کہ اب مجھ میں ہمت نہیں رہی کہ میں کسی اور پیارے اور عزیز کے جنازے کو کندھا دے سکوں۔ میں جنازوں میں شرکت کرنے سے کتراتا ہوں — ہمت کرتا ہوں، لیکن پھر ہمت ٹوٹ جاتی ہے پھر کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو گھسیٹ کر کسی جنازے میں لے جاتا ہوں۔ کتنے ہی پیاروں اور

عزیزوں کے جنازوں میں شرکت کے باوجود مجھے تعزیت کرنے کا گُر نہیں آیا۔ میں لواحقین سے دکھ کا اظہار نہیں کر پاتا — اپنے آپ پر برستا ہوں، اپنے آپ کو کوستا ہوں۔ اندر سے ٹوٹ پھوٹ جاتا ہوں، لیکن خاموش رہتا ہوں۔

رشید جاوید کے ساتھ تو ایک ایسا رشتہ پیدا ہوا تھا جو بے حد خوب صورت، توانا اور پائیدار تھا۔ ہفتوں، مہینوں نہ ملنے کے باوجود اس رشتے کی سچائی اور پائیداری پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا — اس شہر میں ان کی موجودگی کا احساس ہی بڑا طمانیت بخش تھا اور اب لوگ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، اور مجھ میں حوصلہ نہیں، اتنی ہمت نہیں کہ میں اس شخص کو مردہ حالت میں دیکھوں، جسے میں نے ہمیشہ متحرک، فعال، ہنستے بولتے، غصے ہوتے قہقہہ لگاتے، محبت کرتے تو دیکھا ہے، لیکن کبھی مصالحت کرتے، ہتھیار ڈالتے، ساکن و صامت نہیں دیکھا — میں ماضی میں رہنے والا آدمی ہوں کہ میں بدلی ہوئی صورت حال کو آسانی سے قبول نہیں کر سکتا اور پھر میرے پاس اپنے پیاروں کی یادوں کا اتنا قیمتی اور توانا اور زندہ سرمایہ ہے کہ میں ان کے سہارے زندہ رہ سکتا ہوں اور یہ یقین نہیں کر سکتا کہ جن کی یادیں، محبتیں، شفقتیں اتنی متحرک، توانا اور زندہ ہیں وہ مر بھی سکتے ہیں۔

میں بہت سی حقیقتوں کو ماننے کے باوجود ان کو تسلیم نہیں کرتا۔

میں نے انہیں بہت سی کیفیتوں، بہت سی حالتوں میں دیکھا ہے، کتنی ہی یادیں ایسی ہیں، جو اس بڑے اور شفیق اور پرعزم انسان کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ کس کس بات کا ذکر کروں — کیا لکھوں، کیا نہ لکھوں — ابھی تو دل میں طوفان چل رہا ہے۔ میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا سکا۔ جب کچھ طوفان تھمے گا تب شاید میں اس بڑی شخصیت کے کچھ پہلوؤں کا احاطہ کر سکوں۔

اب تو میں ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہوں، جو بڑی اذیت ناک ہے — ان کے صاحبزادوں کے چہرے آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں۔ محمود جاوید، مسعود جاوید اور میری

آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں، دھندلا رہی ہیں۔ میں ان کے پاس جانا چاہتا ہوں لیکن ہمت پھر جواب دے دیتی ہے۔

میری شادی کے دن وہ صبح ہی گھر پہنچ گئے۔ وہ کار کو سجا سنوار کر لائے تھے۔ میں دلہا بن کر ان کے پہلو میں بیٹھا اور وہ برات کی رہنمائی کرتے میرے سسرال لے گئے۔ شام تک وہ وہاں رہے ۔۔ دوست احباب میں بہت سے لوگ واپس چلے گئے لیکن وہ نہیں گئے کیونکہ انہیں اپنی کار میں مجھے اور میری دلہن کو ہمارے گھر تک پہنچانا تھا اور پھر وہ زندگی سے بھرپور شفقتوں اور مسکراہٹوں میں مجھے اور میری دلہن کو ہمارے گھر تک اس بنی سنوری کار میں سوار کر کے چھوڑ گئے۔

میں ایسے شخص کے جنازے میں کس دل اور کس ہمت کے ساتھ شرکت کر سکتا ہوں؟ میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ میں اسے کیسے مردہ سمجھ لوں ۔۔ کیسے تصور کر لوں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں ۔۔

کتبوں پر لکھی ہوئی داستانیں

موت اس کائنات کی سب سے زیادہ اہم اور بنیادی حقیقت ہے۔ موت سے انسان کا رابطہ اس دنیا سے ختم ہوتا ہے اور اس دنیا سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ جہاں اس نے اپنی زندگی میں کئی کارنامے سرانجام دیے تھے۔ آج تک انسان اس طاقت پر غلبہ نہیں پا سکا۔ زندگی اور موت کے دو دھاروں کے درمیان ابدیت کی موجیں چلتی ہیں۔ ہر انسان کے ذہن کے نہاں خانوں میں یہ خواہش موجود ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کر جائے کہ ہمیشہ زندہ رہے۔ اس کا نام ابدالآباد تک لوگوں کی زبان پر آتا رہے۔ امر ہونے کی خواہش دنیا کے ابتدائی انسانوں میں بھی موجود تھی اور آج کا انسان بھی اس خواہش کو اپنے دل سے نہیں نکال سکا۔

لاش کو محفوظ کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ عہد نامہ قدیم کے مطابق دنیا پر سب سے پہلا خون قابیل کے ہاتھوں بہا اور ہابیل کی موت واقع ہوئی۔ روایت ہے کہ ہابیل کی لاش کو قابیل نے گڑھا کھود کر دفنا دیا۔ عہد قدیم کے انسان بھی مُردوں کو دفناتے رہے۔ دفن ہونے والے انسانوں کا نام اور کام محفوظ کرنے کا رواج بھی زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ وحشی اور غیر مہذب دَور کا انسان قبروں پر لکڑی کے بُت نصب کرتا تھا۔ فراعنہ مصر کی قبریں زمین دوز ہونے کے باوجود ان

کی تصاویر سے مرصع کی جاتی تھیں ۔ تاریخ کے اوراق ہیں یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلے کس کی قبر پر تحریری کتبہ نصب کیا گیا تھا. مگر ایک ادنیٰ اندازے کے مطابق قبروں پر کتبے لگانے کی رسم ہزار ہا سال پرانی ہے. ہر ملک میں لوگ اپنے مرنے والے عزیزوں کی قبر پر کتبے لگاتے ہیں ۔ یہ کتبے جہاں عبرت کا درس دیتے ہیں، وہاں مرنے والے کی زندگی کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ بعض صورتوں میں ان کتبوں کی ایک تاریخی اہمیت بھی بنتی ہے کہ ان کتبوں کی مدد سے ہم کسی حد تک اس زمانے کے لوگوں کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں ۔

آج ہم بعض انتہائی دلچسپ کتبوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ۔ یہ کتبے مختلف ممالک میں مختلف قسم کے لوگوں کی قبروں پر نصب ہیں ۔ ان کتبوں کے حوالے سے نہ صرف ہم ان لوگوں کے متعلق بہت کچھ جان سکتے ہیں بلکہ اس زمانے کا مزاج بھی سمجھ سکتے ہیں ۔ ان کتبوں کی مختصر تحریروں میں انسانی نفسیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہت زیادہ مواد ہے. اس کے علاوہ ایک مضحکہ خیز مگر دلچسپ پہلو بھی ان کتبوں کے حوالے سے سامنے آتا ہے ۔ یہ پہلو انسان کی بذلہ سنجی اور ظرافت کا پہلو ہے ۔

اب بعض ایسے لوگوں کی قبروں کے کتبے دیکھیے، جنہوں نے سیاسی اور سماجی زندگی میں بھرپور حصہ لیا ۔ یہ کتبے بعض دلچسپ باتوں کے علاوہ مرنے والوں کے سیاسی عقائد بھی اظہار کرتے ہیں ۔

ایچ جی نوکس کی قبر کا کتبہ ان الفاظ پر مشتمل ہے :

"مہربان دوستو، میں مرنے کے بعد بھی آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ اپنا ووٹ جیننگر برہان کو دینا ۔"

ایگن میں ایک خاندانی قبرستان کے باہر ایک مشترکہ کتبہ نصب ہے ۔ مرنے

والوں کے نام تاریخ پیدائش اور اموات کے بعد یہ مزے دار سطور چٹنہ پر لکھی ہوئی ہیں:

"ہم میں سے کسی نے کبھی بھی روز ویلٹ کو ووٹ دینا گوارا نہیں کیا۔"

امریکہ کی آزادی کی جنگ میں مرنے والے سپاہی کی قبر پر کتبہ وطن کے ساتھ بے لوث محبت کا اظہار کرتا ہے:

"بریڈ سلے ۔ وفات ۲۴ جنوری ۱۸۵۰ء (عمر ۷۵ سال سات ماہ ۲۱ دن)
۱۷۷۶ء کی جنگ آزادی میں رضاکارانہ لڑائی لڑی ۔ پنشن کی پیش کش کی گئی مگر ٹھکرا دی گئی۔"

بعض قبروں کے کتبے انسانوں کی غلطیوں کا دائمی ماتم کرتے ہیں۔ ایک قبر کا کتبہ ہے:

"جارج جانسن، غلطی سے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔"

مگر اس کے برعکس چار آدمیوں کی قبروں کا مشترکہ کتبہ قانونی قسم کی زبان سے مرصع ۔ اور آخر میں لکھا گیا ہے:

"قانوناً پھانسی پر لٹکائے گئے۔"

پھانسی پر لٹکانے کی تاریخ ۸ مارچ ۱۸۴۰ء ۔

قبروں کے کتبے ۔ جہاں انسانوں کو دنیا کے فانی ہونے کا احساس دلاتے ہیں اور عبرت کا درس دیتے ہیں ۔ وہیں بعض کتبے پر لطف، مضحکہ خیز اور دلچسپ انداز کے حامل ہوتے ہیں ۔

ایک بستی میں رات کو گھوڑے چرانے والے گئے ۔ وہ ابھی گھوڑے کھول کر گاؤں سے باہر نکل ہی رہے تھے کہ پولیس نے پکڑ لیا۔ بستی کے لوگ انہیں تھانے سے نکال کر جنگل میں لے گئے، وہاں انہیں پھانسی دے دی گئی ۔ ان لوگوں نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی مشترکہ قبریں بنائیں اور اس پہ کتبہ بھی نصب کیا۔ یہ کتبہ،

کالوریڈو کے قبرستان میں موجود ہے ۔

"گھوڑوں کی چوری کرنے والے حضرات خبردار رہیں ۔
یہاں ایلن کرولی اور ہال دفن ہیں جنہوں نے دوسرے گھوڑے چرانے والوں کی طرح عروج اور زوال کے دن دیکھے "

امریکہ میں حبشیوں کے قبرستان ۔۔۔ ایک ایسے عہد کی داستان سناتے ہیں۔ جب حبشی سفید فاموں کے غلام تھے ۔ یہ کتبے ان کی تاریخ کے ایک المناک باب کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ان کتبوں میں انسانی زندگی کا پورا کرب کھدا ہوا ہے ایک حبشی کی قبر کا کتبہ دیکھیے :

" خدا نے ہمیں آزاد پیدا کیا، مگر انسانوں نے ہمیں غلام بنا لیا "
" یہاں جان جیک افریقی باشندہ دفن ہے ۔ وہ اگرچہ اپنے ملک میں غلام پیدا ہوا، مگر آزاد تھا ۔ پھر وہ ایک آزاد ملک میں لایا گیا ۔ مگر غلام تھا ۔ اُس نے اپنی محنت اور چھوٹی چھوٹی بے ایمانیوں سے پیسہ جمع کیا اور اپنے مالک کو رقم دے کر اپنی آزادی خریدی، مگر موت نے اسے مکمل طور پر آزاد کر دیا ۔۔۔"

ایک اور قبر کا کتبہ :

" یہاں کیتھرائن سینڈرج دفن ہیں ۔ ہم اسے " آنٹ کٹی " کہا کرتے تھے وہ غلام تھی اور غلام کی بیوی تھی ۔ میاں بیوی نے کئی سال تک فاضل کام کیا اور ایک ہزار ڈالر دے کر آزادی خریدی "

موت ایک ایسا اسرار ہے جسے آج تک کوئی حل نہیں کر سکا ۔ صدیوں سے انسان کو موت نے متحیر اور پریشان کیا ہوا ہے ۔ صدیوں سے انسان موت کی حقیقت جاننے کی کوششوں میں لگا ہوا ہے ۔۔۔ انسان کا یہی احساس، یہی تجسس قبروں کے کتبوں پر بھی نظر آتا ہے : . .

"میں پیدا ہوا کیسے ؟ میں نہیں جانتا ۔
میں چل دیا کہاں ؟ میں نہیں جانتا ۔"

"اس کا کام ختم ہوا ۔ صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تو اس نے چراغ کو پھونک مار کر بجھاتے ہوئے کہا ۔ میں چلا ۔ الوداع ۔"

"وہ انجانے گھر چلا گیا ۔"

بعض قبروں کے کتبے مُردوں کے عقائد کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ایک دہریے لیکچرار کی قبر کا کتبہ صرف تین الفاظ پر مشتمل ہے :
"خدا کہاں ہے ؟"
ایک مادہ پرست کی قبر کا کتبہ دلائل سے پُر نظر آتا ہے ۔
"خدا کوئی شے نہیں ہے ۔ نہ ہی آدمی میں کوئی رُوح ہوتی ہے ۔ موت انسان کا خاتمہ ہے اور بس ۔ انسان نے کلیسا کی وجہ سے ترقی نہیں کی بلکہ انسانی ترقی صرف سائنس کی وجہ سے ہوسکی ہے ۔ روح اور خدا کے ماننے والوں کے لیے جہنم ہے ۔"
کسی ستم ظریف نے اس کتبے کے نیچے بچی کچی جگہ پر یہ الفاظ لکھ کر اس کتبے کو زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے :
"وہ جس نے اوپر کی عبارت لکھی ۔ خوب آدمی تھا ۔ شیطان بیقراری سے دوزخ میں اُس کا انتظار کر رہا ہے ۔"
اس کے برعکس دو ڈاکٹروں کی قبروں کے کتبے پڑھیے :

"میں نے پچھلے پچاس برس تک میساچوسٹس میں مریضوں کا علاج کیا ہے اور ان پچاس سالوں میں میرے مریضوں کی تعداد کبھی کم نہ ہوئی۔"

ڈاکٹر فریڈرابرٹس — (وفات ۱۹۳۱ء) کی قبر کا کتبہ بڑا دلچسپ ہے:

"مطب عالم بالا میں منتقل ہو چکا ہے۔"

جیسی جیمز — امریکہ کا مشہور مجرم گزرا ہے — وہ مجرموں کے ایک بڑے گروہ کا سردار تھا — یہ جیسی جیمز، امریکہ کا ایک عوامی اور لوک کردار بن چکا ہے — ایک ڈاکے میں مال کی تقسیم پر جھگڑا ہو گیا تو اس کے ایک ساتھی نے پولیس کو خبر کر دی۔ جیسی جیمز پولیس کے ساتھ مقابلے میں مارا گیا — اس کی ماں نے اس کے کتبے پر یہ تحریر لکھوائی:

"وہ ایک بزدل اور غدار کی وجہ سے مارا گیا — اس کا نام اس قابل نہیں کہ یہاں لکھا جائے۔"

کیلے فورنیا کی سپریم کورٹ کے جج سیلاس سینڈرس کی قبر کا کتبہ:

"آخری فیصلہ دے دیا گیا۔"

نیو کرولینا کے ایک وکیل کی قبر کا کتبہ:

"بلاشبہ وہ ایک دیانت دار وکیل تھا۔"

ایک دوسرے وکیل کا کتبہ:

"وکیل صفائی محوِ استراحت ہے۔"

زندگی کے مختلف پیشوں اور شعبوں میں کام کرنے والوں کی قبروں کے کتبے ان کے پیشے کی خاص اصطلاحوں سے پُر نظر آتے ہیں — اس کے علاوہ یہ کتبے

بعض دلچسپ حقائق بھی سامنے لاتے ہیں اور ان کتبوں کے پس منظر میں ان لوگوں کی مصروفیات کا پتا چل جاتا ہے۔

لورینزو ہرگوسن ایک مشہور صحافی تھا — اس کی قبر کا کتبہ ان الفاظ میں موت کی داستان سناتا ہے:

"آخری کاپی جا چکی ہے۔"

ایک سفری ایجنٹ کا کتبہ:

"میرا سفر تمام ہوا — مجھے گھر بھجوا دیں۔"

سب سے زیادہ دلچسپ کتبہ ایک گورکن کا ہے، جس کی قبر ڈورچسٹر میں واقع ہے۔ یہ کتبہ دو حصوں میں منقسم ہے — اپنے حصے میں گورکن نے موت سے قبل اپنے پیشے اور کام کا ذکر یوں کیا ہے:

"یہ قبر ۱۸۲۳ء میں کھودی اور مکمل کی گئی۔ اسے ڈینئیل ڈیونیرٹ نے اس وقت کھودا جب اس کی عمر ۳۰ سال کی تھی — وہ اب تک ایک ہزار ایک سو پینتیس جنازوں میں شریک ہو چکا ہے — وہ اب تک سات سو چونتیس قبریں کھود چکا ہے — دوسروں کی قبریں کھودنے کے بعد اس نے اپنی قبر کھودی ہے کیونکہ ایک دن اسے بھی مرنا ہے۔"

اس کے بعد کتبے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے:

"وہ ۱۸۹۰ء میں مرا — مرنے تک وہ ایک ہزار آٹھ سو پینتیس قبریں کھود چکا تھا۔"

ویانا کے قبرستان میں ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر کا کتبہ:

"سکول بند ہوا، استاد گھر جا چکا ہے۔"

میساچوئس میں ایک موچی کی قبر کا کتبہ :

"میرے جوتے بن چکے ہیں، میرے دوستو ۔
اب میں اپنے گھر جا رہا ہوں ۔۔ میں کہاں جاؤں گا اور کتنی دور؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔"

انکاشائر میں ایک کنواری عورت کا کتبہ :

"اس کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی کبھی نہیں سجی۔"

بچوں کی قبروں کے کتبے بڑے المناک شاعرانہ اور بڑے دکھ بھرے ہوتے ہیں ۔۔ ایک جینی شاعر نے اپنے بیٹے کی موت پر جو کتبہ لکھا تھا، وہ کلاسیک میں شامل ہو چکا ہے :

"وہ پھولوں کی تلاش میں بہت دور نکل گیا۔"

اورگین کے قبرستان میں ایک بچے کی قبر کا کتبہ ۔۔ اس کے والدین کے دکھ کا اظہار یوں کرتا ہے :

"شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بچے کھیلتے رہیں گے، سوائے ہارے الفریڈ الینگ کے۔"

ایک پانچ سال کے بچے کی قبر کا کتبہ ۔۔

اس بچے کی مختصر زندگی کی داستان ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :

"پھل لگا ۔۔ خراب ہوا ۔۔
اور ٹوٹ کر زمین پر گرا
مگر ہم اسے کبھی نہ بھول سکیں گے۔"

اس کے برعکس ایک لمبی عمر پانے والے بوڑھے کا کتبہ دوسری ہی کہانی سناتا ہے:

"او میں مرنا نہیں جانتا تھا۔"

کچھ آدم بیزار لوگوں کی قبروں کے کتبے دیکھیے —

"وہ جنہوں نے میری زندگی میں میری خبر گیری کی، وہ جانتے ہیں کہ یہ قبر کس کی ہے —

دوسرے لوگوں کو میرے ساتھ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

کیلی فورنیا میں بُرے ہمسائے سے تنگ آئے ہوئے انسان کی قبر کا کتبہ ہمسایوں کے ذکر سے خالی نہیں:

"میری موت میرے ہمسایوں کے ہاتھوں واقع ہوئی — جو مجھے تنگ کرتے رہتے تھے — اب تو مجھے آرام سے سونے دو۔"